

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

— بیاد —

شیخ الحدیث حضرت مولانا
محمد سرفرز خان صفدر

شیخ التفسیر حضرت مولانا

صوفی عبدالحمید سواتی

وحدت امت کا داعی اور غلبہ اسلام کا علم بردار

ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ

جلد: ۲۶ • شماره: ۱۰ • اکتوبر ۲۰۱۵ء

○

کلمہ حق

۲ رئیس التحریر ملی مجلس شرعی کے اجلاس کے اہم فیصلے امیری
صحافتی زندگی / سنی شیعہ اختلافات

آرا و افکار

۱۰ مولانا سید سلمان حسینی فقہی مسالک کے درمیان جمع و تطبیق
۲۲ مولانا مفتی محمد زاہد پاکستان کے اسلامی تحقیقی ادارے: جائزہ و تجاویز

حالات و واقعات

۳۳ خورشید احمد ندیم مدارس کی اصلاح: ایک اور کمیٹی
۳۶ مولانا مفتی منیب الرحمن وزیر اعظم ہاؤس میں اجلاس

مباحثہ و مکالمہ

۳۹ مولانا عبدالستین منیری امام ابن جریر طبری کی جلالت - چند مزید باتیں
۴۷ مولانا عتیق الرحمن سنبھلی مکاتیب

تعارف و تبصرہ

۵۲ مولانا وقار احمد ذخیرۃ الجنان فی فہم القرآن

○

رئیس التحریر

ابوعمار زاہد الراشدی

مدیر

محمد عمار خان ناصر

مجلس تحریر

پروفیسر غلام رسول عدیم

میاں انعام الرحمن

ڈاکٹر محمد اکرم ورک

محمد یوسف ایڈووکیٹ

شبیر احمد خان میواتی

انتظامیہ

ناصر الدین خان عامر

عبدالرزاق خان

حافظ محمد طاہر

زر تعاون	خط کتابت کے لیے	زیر اہتمام	شعبہ ترسیل
سالانہ 300 روپے	ماہنامہ الشریعہ	الشریعیہ اکادمی	مکتبہ امام اہل سنت
بیرون ملک سے	پوسٹ بکس 331 گوجرانوالہ	ہاشمی کالونی ننگنی والا گوجرانوالہ	جامع مسجد شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ
25 امریکی ڈالر	aknasil2003@yahoo.com	www.alsharia.org	0306-6426001

ناشر: حافظ محمد عبدالستین خان زاہد - طابع: مسعود اختر پرنٹرز، میکلوڈ روڈ، لاہور

مجلس شرعی کے اجلاس کے اہم فیصلے

10 ستمبر 2015ء کو بعد نماز مغرب جامعہ اشرفیہ الہور میں مجلس شرعی پاکستان کا ایک اہم اجلاس مولانا مفتی محمد خان قادری کی زیر صدارت منعقد ہوا جس میں مولانا حافظ فضل الرحیم، مولانا زاہد الراشدی، علامہ احمد علی قصوری، علامہ خلیل الرحمن قادری، مولانا عبدالملک محمد ڈاکٹر امین، مولانا حافظ محمد نعمان، جسٹس (ر) میاں نذیر اختر، جسٹس (ر) میاں سعید الرحمن فرخ، ڈاکٹر سید محمد مہدی، ڈاکٹر محمد توقیر، مولانا حافظ عبدالغفار روپڑی، مولانا سید عبدالوحید شاہ، حافظ عاکف سعید، ڈاکٹر فرید احمد پراچہ، قاری جمیل الرحمن اختر، مولانا محمد رمضان، مولانا اشرف علی، مرزا محمد ایوب بیگ، اور دیگر حضرات نے شرکت کی۔ اجلاس کے لیے سیکرٹری جنرل پروفیسر ڈاکٹر محمد امین کی طرف سے مندرجہ ذیل ایجنڈا شرکاء کو بھجوا گیا تھا:

(۱) سپریم کورٹ کا مخدوش فیصلہ

آئینی ترمیم کے حق میں پاکستان کی عدالت عظمیٰ کے اکثریتی فیصلے نے پارلیمنٹ کو آئین میں ترمیم کا لامحدود اختیار دے دیا ہے، سوائے تین امور کے جن میں اسلامی دفعات اور آئین کا اسلامی مزج اور ڈھانچہ شامل نہیں ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ پارلیمنٹ جب چاہے آئین کی اسلامی دفعات ختم کر سکتی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ ایک خطرناک صورت حال ہے جو اسلامی جماعتوں اور اداروں کے لیے کسی حالت میں بھی قابل قبول نہیں ہے۔ لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اس فیصلے کو چیلنج کیا جائے اور فل کورٹ کے لیے ریویو پٹیشن داخل کی جائے اور علماء کرام و عوام کو متحرک کیا جائے کہ وہ اس تشویش ناک صورت حال کی سنجیدگی اور الم نالی کو محسوس کریں۔

(۲) قانون توہین رسالت اور ممتاز قادری کیس

مجلس نے پچھلے اجلاس میں طے کیا تھا کہ ممتاز قادری کیس میں عدالت عظمیٰ کے ججوں کے رویے کے پیش نظر رائے عامہ کو متحرک کیا جائے۔ اس کے لیے علامہ احمد علی قصوری صاحب کی کنوینشن میں ایک کمیٹی قائم کی گئی تھی۔ وہ کمیٹی اپنی رپورٹ اور آئندہ کالاکہ عمل پیش کرے گی۔ نیز جسٹس (ر) سعید الرحمن فرخ صاحب قانون توہین رسالت کی بقاء کے حوالے سے اپنی کوششوں کے بارے میں بتائیں گے۔

(۳) دینی مسالک اور علماء کرام کے لیے ضابطہ اخلاق

ملی مجلس شرعی کے بانی رکن اور جامعہ اشرفیہ کے نائب مہتمم مولانا حافظ فضل الرحیم نے (جو حکومت پنجاب کے قائم کردہ متحدہ علماء بورڈ کے صدر بھی ہیں) منافرت آمیز مواد کے خاتمے کے حوالے سے ایک تحریر تیار کی ہے جو انہوں نے مختلف علماء کو بھیجی۔ مجلس کے صدر مولانا مفتی محمد خان قادری صاحب نے اپنی ذاتی حیثیت میں اس مسودے کے بارے میں تجاویز دیں۔ دونوں کی فوٹو کاپیاں ارکان مجلس کی خدمت میں ارسال ہیں جنہیں وہ پڑھ کر تشریف لائیں تاکہ مجلس کی طرف سے ایک متحدہ موقف اختیار کیا جاسکے۔

(۴) مولانا زاہد الراشدی صاحب کا خط اور تجاویز

مجلس نے اپنے سابقہ اجلاس میں طے کیا تھا کہ جاوید احمد غامدی صاحب کے گمراہ کن افکار کے بارے میں علماء کرام کے متفقہ موقف کے لیے صدر و جنرل سیکرٹری ایک تحریر تیار کریں۔ اسی طرح قضیہ یمین کے بارے میں طے ہوا تھا کہ متعلقہ ممالک کی حکومتوں کو صلح و جنگ کے قرآنی اصولوں کی طرف متوجہ کیا جائے تاکہ امت میں اختلاف و انتشار کا خاتمہ ہو۔ ان دونوں نکات پر عملدرآمد کے حوالے سے مولانا زاہد الراشدی نے مجلس کے جنرل سیکرٹری کو ایک خط لکھا جس کی فوٹو کاپی لف بند ہے..... تاکہ ارکان مجلس ان معاملات میں اپنی رائے دے سکیں۔

سیکرٹری جنرل کے نام مولانا زاہد الراشدی کا خط:

”گزارش ہے کہ ملی مجلس شرعی کے 14 جون کے اجلاس کی کاروائی ”البرہان“ کے جون ہی کے شمارہ میں پڑھ لی تھی مگر ایک دوسری گزارشات پیش کرنے میں کچھ تاخیر ہوگئی۔

☆ جاوید احمد غامدی صاحب کے افکار کے حوالے سے میری تجویز یہ ہے جو میں نے لاہور کے ایک بڑے مفتی صاحب محترم کے استفسار پر ان کی خدمت میں بھی عرض کی تھی کہ غامدی صاحب کی تحریرات کا بغور جائزہ لے کر ان کے بارے میں اشکالات مرتب کیے جائیں اور انہیں وضاحت کے لیے بھجوائے جائیں۔ اگر وہ وضاحت سے انکار کر دیں یا ان کی وضاحت قابل قبول نہ ہو تو اس کے بعد ایک متوازن اور ٹھوس رائے قائم کر کے اس پر مختلف مکاتب فکر کے علماء کرام کے دستخط کرائے جائیں۔ اس لیے کہ جس شخص کے بارے میں ہم اپنی رائے کا اعلان کرنا چاہتے ہیں وہ اگر زندہ موجود ہے تو اسے وضاحت کا موقع دے بغیر کسی حتمی رائے یا فتویٰ کا اعلان میرے خیال میں مناسب بات نہیں ہوگی۔

☆ قضیہ یمین کے حوالے سے مجلس کی رائے اصولی طور پر درست ہے مگر صرف موجودہ صورت حال کو بنیاد بنانے کی بجائے حالات کو یہاں تک پہنچانے کے اسباب و عوامل کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔ میری تجویز ہے کہ ملی مجلس شرعی کو اس مسئلہ پر وسیع تر مکالمہ و مباحثہ کا اہتمام کرنا چاہیے اور اہل سنت و اہل تشیع کے سنجیدہ اہل دانش کو باہمی تبادلہ خیالات کا موقع فراہم کرنا چاہیے۔ کیونکہ جب تک اسباب و عوامل کا جائزہ لے کر ان کے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کر لی جائے، صرف معروضی حالات کو کسی حکمت عملی کی بنیاد بنانا قرین انصاف نہیں ہوگا۔“

جامعہ اشرفیہ میں منعقدہ اجلاس کی کاروائی

جامعہ اشرفیہ لاہور میں 10 ستمبر کو منعقدہ اجلاس میں سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے کا جائزہ لیا گیا اور اس امر پر تشریح کا اظہار کیا گیا کہ فیصلے میں دستور کے ناقابل ترمیم حصوں کا ذکر کرتے ہوئے اسلامی دفعات اور قرارداد مقاصد کا معاملہ گول کر دیا گیا ہے۔ اس پر سپریم کورٹ سے نظر ثانی کے لیے رجوع کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور طے پایا کہ جسٹس (ر) میاں نذیر اختر، جسٹس (ر) میاں سعید الرحمن فرخ اور پروفیسر ڈاکٹر محمد امین پر مشتمل کمیٹی دیگر حضرات سے مشاورت کے بعد عملی طریق کار طے کرے گی۔ جبکہ عید الاضحیٰ کے بعد اجلاس میں اس کے بارے میں حتمی فیصلہ کیا جائے گا۔

اجلاس میں ممتاز قادری کیس کے سلسلہ میں رائے عامہ کو منظم کرنے کے لیے علامہ احمد علی قصوری کی سربراہی میں قائم کمیٹی کو دوبارہ متحرک کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور مولانا قصوری نے بتایا کہ وہ جلد از جلد کمیٹی کا اجلاس بلا کر عملی پروگرام کی ترتیب طے کریں گے۔

اجلاس میں ”تحریک انسداد سوڈ“ کی کارکردگی کا بھی جائزہ لیا گیا اور رابطہ کمیٹی کے کنوینر مولانا زاہد الراشدی نے بتایا کہ وہ عید الاضحیٰ کے بعد رابطہ کمیٹی کا اجلاس طلب کریں گے جس میں مہم کو آگے بڑھانے کا لائحہ عمل طے کیا جائے گا۔ اجلاس میں متحدہ علماء بورڈ کا مختلف مذہبی مکاتب فکر کے لیے تجویز کردہ ضابطہ اخلاق زیر بحث آیا اور طے پایا کہ اس سلسلہ میں پیش کی جانے والی تجاویز کا جائزہ لے کر آئندہ اجلاس میں حتمی رپورٹ پیش کی جائے گی۔ جبکہ ان کا جائزہ لینے کے لیے مولانا مفتی محمد خان قادری، پروفیسر ڈاکٹر محمد امین اور علامہ خلیل الرحمن قادری پر مشتمل کمیٹی تشکیل دی گئی۔

اجلاس میں مولانا زاہد الراشدی کی اس تجویز سے اتفاق کیا گیا کہ جاوید احمد غامدی صاحب کے تنازعہ افکار کے حوالہ سے کسی مشترکہ موقف کے اعلان سے پہلے ان کے بارے میں اعتراضات و اشکالات مرتب کر کے انہیں بھجوائے جائیں اور ان کی طرف سے جواب موصول ہونے یا انکار کر دینے کے بعد کوئی مشترکہ رائے قائم کر کے اس کا اعلان کیا جائے۔

یمن کے قضیہ کے بارے میں غور و خوض کے بعد طے پایا کہ مولانا مفتی محمد خان قادری اور ڈاکٹر محمد امین یمن، سعودی عرب اور ایران کے سفارت خانوں سے رابطہ کر کے انہیں یمن کے تنازعہ کے بارے میں ملی مجلس شرعی کے جذبات سے آگاہ کریں گے اور ضرورت پڑنے پر باقاعدہ وفد کی صورت میں ان سفارت خانوں سے ملاقات و رابطہ کا اہتمام کریں گے۔ اس سلسلہ میں مولانا زاہد الراشدی کی اس رائے سے اجلاس میں اتفاق کیا گیا کہ صرف یمن کی بجائے مشرق وسطیٰ کی مجموعی صورت حال اور بڑھتی ہوئی سنی شیعہ کشیدگی کے اسباب و عوامل کا جائزہ لینے کے بعد اس کے بارے میں مشترکہ موقف پیش کیا جائے اور اس مقصد کے لیے سنجیدہ سنی اور شیعہ راہ نماؤں کے درمیان مشاورت اور تبادلہ خیالات کا بھی اہتمام کیا جائے تاکہ کوئی متوازن موقف طے کیا جاسکے۔

اجلاس میں جسٹس (ر) میاں سعید الرحمن فرخ نے ناموس رسالت کے تحفظ کے قانون کے حوالہ سے نفاذ قانون

کے پس منظر اور اس کے تقاضوں سے شرکاء کو آگاہ کیا۔ اور حاضرین نے اس عزم کا اظہار کیا کہ تحفظ ناموس رسالت کے قانون کے خلاف سازشوں کا بھرپور مقابلہ کیا جائے گا۔

میری صحافتی زندگی

اخبارات و جرائد میں کسی نہ کسی بہانے مراسلے، بیانات، اجلاسوں کی رپورٹیں اور ہلکے پھلکے مضامین لکھنے کا ”چسکہ“ تو 1964ء میں ہی شروع ہو گیا تھا جب میں جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں اپنی طالب علمی کے تیسرے سال میں تھا۔ حافظ سید جمیل الحسن مظلوم مرحوم ”نوائے گوجرانوالہ“ کے نام سے ہفت روزہ اخبار نکالتے تھے۔ گھنٹہ گھر کے قریب چوک غریب نواز میں دفتر تھا جو ہمارے مدرسہ سے چند قدم کے فاصلے پر ہے۔ مولانا عزیز الرحمن خورشید اور مولانا سعید الرحمن علویؒ بھیرہ کے حضرت مولانا محمد رمضان علویؒ کے فرزند تھے اور نصرۃ العلوم میں زیر تعلیم تھے۔ ان کا اور میرا مشترکہ ذوق یہ تھا کہ بیانات اور مضامین لکھ کر اخبارات میں شائع کرانے کی کوشش کرنا۔ اور پھر شائع شدہ بیان یا مضمون دوستوں کو پڑھانا۔ ”نوائے گوجرانوالہ“ کے علاوہ ہفت روزہ ”قومی دلیر“ اور ”تخفہ“ بھی مقامی اخبارات تھے اور ہماری ابتدائی جولانگہ یہی جرائد تھے۔ جمعیت علماء اسلام پاکستان کے آرگن ہفت روزہ ”ترجمان اسلام“ لاہور کو بھی مضامین بھجوائے جاتے تھے جن میں اکثر شائع ہو جاتے تھے۔

البتہ صحافتی زندگی میں میری باضابطہ انٹری ستمبر 1965ء میں ہوئی جب میں نے لگھڑ میں روزنامہ وفاق لاہور کے نامہ نگار کے طور پر کام شروع کیا۔ 6 ستمبر کو جنگ کے پہلے مرحلہ میں ہی صبح نماز کے وقت لگھڑ ریلوے اسٹیشن پر بھارتی فضائیہ کے طیاروں نے بمباری کی جس میں ہمارے ایک دوست صفدر باجوہ شہید ہو گئے۔ وہ ریلوے اسٹیشن کی دوسری جانب اپنے کھیتوں کی طرف جا رہے تھے کہ بھارتی طیارے کی بمباری کا نشانہ بن گئے۔ میں نے اس واقعہ پر ایک فچر لکھا جو روزنامہ وفاق لاہور میں شائع ہوا تھا۔ یہ میری صحافتی زندگی کا عملی آغاز تھا اور اس کے بعد روزنامہ وفاق کے نامہ نگار کے طور پر کچھ عرصہ کام کرتا رہا۔

حافظ سید جمیل الحسن مظلوم حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مجاز صحبت حضرت حافظ عنایت علی رحمہ اللہ تعالیٰ کے فرزند تھے۔ انجمن صحافیان کے ضلعی صدر تھے اور قائد صحافت کہلاتے تھے۔ میری خبر نویسی کی حوصلہ افزائی میں ان کا بہت حصہ ہے۔ ”نوائے گوجرانوالہ“ میں ہی راشد بزمی مرحوم اور حافظ خلیل الرحمن ضیاء مرحوم سے تعارف ہوا۔ بزمی صاحب مرحوم ایک عرصہ تک روزنامہ جنگ کے نمائندہ خصوصی رہے جبکہ حافظ خلیل الرحمن ضیاء کا تعلق بھی جنگ اور وفاق سے رہا۔ حافظ صاحب مرحوم جامعہ نصرۃ العلوم کے فاضل اور میرے دورہ حدیث کے ساتھی بھی تھے۔ اس وقت گوجرانوالہ میں مختلف اخبارات کے نمائندوں میں بڈل احمد ایوبی مرحوم، کیف صہبائی مرحوم، اعجاز میر مرحوم، اکرم ملک، اور جی ڈی بھٹی نمایاں تھے۔ اور ان سب سے میرے دوستانہ مراسم تھے۔ ان کے ساتھ میری انڈر

اسٹینڈنگ تھی کہ میں جمعیت علماء اسلام یا کسی دینی تحریک کے حوالہ سے کوئی خبر بھجواتا تو وہ نہ تو کسی لیٹر پیڈ پر ہوتی اور نہ ہی اس پر مہر اور دستخط موجود ہوتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ تمہاری بھجوائی ہوئی خبر پر کسی کمی بیشی کی ضرورت نہیں ہوتی، اس لیے سادہ کاغذ پر لکھ کر بھیج دیا کرو۔ وہ میری ہینڈ رائٹنگ پہچانتے تھے اور اسے دیکھ کر اسی پر دستخط ثبت کر کے اپنے اپنے اخبارات کو بھجوادیا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ سا لہا سال چلتا رہا۔

ہفت روزہ ”ترجمان اسلام“ لاہور اور ہفت روزہ ”خدام الدین“ لاہور میں بھی وقتاً فوقتاً لکھنے کا کام جاری رہا جو آگے چل کر ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور کی باقاعدہ ادارت سنبھالنے تک پہنچا، اور میں کئی برس جمعیت علماء اسلام پاکستان کے ہفت وار آرگن کا ایڈیٹر رہا۔ جمعیت علماء اسلام پاکستان کے مرکزی سیکرٹری اطلاعات اور پاکستان قومی اتحاد کے صوبائی سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے مجھے حضرت مولانا مفتی محمود اور نواب زادہ نصرہ اللہ خان مرحوم کی سا لہا سال تک رفاقت کا شرف حاصل رہا اور میں نے ان بزرگوں سے بہت کچھ سیکھا جس سے میرے صحافی شعور میں پختگی آئی۔ معروف احرار راہ نما جاناب زمر زامرحوم ماہنامہ ”تبصرہ“ کے نام سے ایک عرصہ سے جریدہ شائع کر رہے تھے جس کی اشاعت میں 77/78ء کے دوران کچھ وقفہ آیا تو میری درخواست پر انہوں نے یہ جریدہ میرے حوالے کر دیا۔ اور میں نے اپنے رفیق مولانا صالح محمد حضروی کی رفاقت میں کئی ماہ تک اس کی اشاعت و ادارت کا اہتمام کیا۔

1989ء کے آخر میں ”الشریعہ“ کے نام سے میں نے ایک مستقل جریدہ کا ڈیکلیریشن حاصل کیا جو گوجرانوالہ سے تب سے تسلسل کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اس کا مدیر مسؤل میں خود ہوں جبکہ مدیر کے طور پر ایڈیٹر پروفیسر حافظ محمد عمار خان ناصر کم و بیش دو عشروں سے خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ عمار خان ناصر جامعہ نصرۃ العلوم کا فاضل اور پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے انگلش ہے، اور اب پی ایچ ڈی کے مراحل سے گزر رہا ہے۔ جبکہ گفٹ یونیورسٹی گوجرانوالہ میں اسلامیات کے شعبہ ایم فل کا استاذ و نگران ہے۔

قومی اخبارات جنگ، نوائے وقت، مشرق اور وفاق میں وقتاً فوقتاً مختلف عنوانات پر لکھتا آ رہا ہوں، مگر برادر مہر حامد میر اور مولانا اللہ وسایا قاسم شہید کی ترغیب پر میں نے باقاعدہ ”کالم نگاری“ کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ حامد میر صاحب ان دنوں روزنامہ پاکستان اسلام آباد کے مدیر تھے اور وہیں سے میں نے کالم لکھنے کا آغاز کیا تھا۔ بعد میں وہ روزنامہ اوصاف میں گئے تو میں بھی ان کے ساتھ ہی اوصاف میں منتقل ہو گیا۔ اس کے بعد مختلف اتار چڑھاؤ آئے مگر روزنامہ پاکستان لاہور، روزنامہ اسلام کراچی اور روزنامہ اوصاف اسلام آباد میں میرے کالم الگ الگ عنوانات سے مسلسل چھپتے رہے ہیں جس کی تازہ ترین صورت یہ ہے کہ ہفتہ میں ایک یا دو کالم لکھتا ہوں جو (۱) روزنامہ اوصاف (۲) روزنامہ اسلام اور (۳) روزنامہ انصاف میں بیک وقت شائع ہو جاتے ہیں۔ اور اس پر ملک بھر سے احباب کی دعائیں ملتی رہتی ہیں، فالحمد للہ علی ذلک۔

ستمبر 2015ء کے پہلے عشرہ میں میری باقاعدہ صحافی زندگی کے پچاس سال مکمل ہو رہے ہیں جس پر ”تحدیثِ نعت“ کے طور پر چند سطور میں اپنی اس شعبہ کی کارگزاری قارئین کی خدمت میں پیش کر دی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل

ہے اور بزرگوں کی شفقتیں اور دعائیں ہیں کہ اللہ رب العزت تدریس، خطابت اور صحافت کے تینوں شعبوں میں کسی نہ کسی حوالہ سے دین کی کچھ نہ کچھ خدمت لیتے آ رہے ہیں۔ قارئین سے درخواست ہے کہ وہ خصوصی طور پر دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ زندگی بھر یہ خدمت لیتے رہیں اور ایمان و اعمال صالحہ پر خاتمہ نصیب فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

سنی شیعہ اختلافات

مشرق وسطیٰ ہو یا پاکستان، ہم کسی بھی جگہ سنی شیعہ کشیدگی میں اضافہ اور اس کے فروغ کے حق میں نہیں ہیں اور پہلے کی طرح اب بھی دل سے چاہتے ہیں کہ اس کی شدت اور سنگینی میں کمی لائی جائے اور اس ماحول کو بحال کرنے کی کوشش کی جائے جو سنی شیعہ کشیدگی کے باقاعدہ خانہ جنگی کی صورت اختیار کرنے سے قبل موجود تھا کہ باہمی اختلافات کے باوجود مشترکہ قومی مسائل میں ایک دوسرے سے تعاون کیا جاتا تھا، اختلافات کو دلیل اور مناظرہ کے دائرے میں محدود رکھا جاتا تھا، ایک دوسرے کے عقیدہ و موقف پر شدید تنقید بھی کچھ حدود کا لحاظ رکھتی تھی، اور باہمی قتل و قتال اور تصادم سے ہر ممکن گریز کیا جاتا تھا۔ ہم نے پاکستان کے قیام کی تحریک سے لے کر تحریک ختم نبوت، تحریک نظام مصطفیٰ، تحریک تحفظ ناموس رسالت اور دیگر دینی و قومی تحریکات میں مشترکہ کردار ادا کیا ہے۔ اور ان تمام تر اختلافات کے باوجود کیا ہے جنہوں نے اب ہمیں ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا رکھا ہے۔ اور سنی شیعہ اختلافات کا جملہ زبان پر آتے ہی دل و دماغ میں عجیب سے ہیجان پیا ہونے لگتا ہے۔

جہاں تک اختلافات کی بات ہے وہ تو صدیوں سے چلے آ رہے ہیں اور قیامت تک رہیں گے۔ انہیں ختم نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی دونوں میں سے کوئی گروہ دوسرے کو ختم یا مغلوب کر سکتا ہے۔ یہ اختلاف عقیدہ میں بھی ہے، شخصیات میں بھی ہے، فقہ و شریعت میں بھی ہے، اور رسوم و عبادات میں بھی ہے۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ یہ اختلافات کسی طرح ختم کیے جاسکتے ہیں تو وہ انسانی فطرت، معاشرتی نفسیات اور تاریخی پس منظر و عوامل سے بے خبری کا اظہار کرتا ہے۔ البتہ ان اختلافات کا ایسا اظہار اور ان کی بنیاد پر ایسا باہمی رویہ ضرور غور طلب ہے جو کشیدگی میں اضافے کا باعث بنتا ہے اور باہمی تصادم کی راہ ہموار کرتا ہے۔ اس کا سنجیدگی سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ ہم اس پر غور و خوض کی اہل فکر و دانش کو وقتاً فوقتاً دعوت دیتے رہتے ہیں اور اسے اپنی دینی و قومی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔

دراصل ہمارے ہاں یہ سوچ مسلسل پروان چڑھ رہی ہے کہ کسی مسئلہ کو ”کیمو فلاج“ کر دینے سے شاید اس کے حل کی کوئی صورت نکل آتی ہے۔ یعنی مسئلہ کے وجود سے انکار کر دیا جائے، اس پر بحث و تہیج سے گریز کیا جائے، اور اسے نظر انداز کیا جاتا رہے تو وقتی طور پر وہ آنکھوں سے ضرور اوجھل ہو جاتا ہے لیکن اس کی سطح سمندر جیسی خاموشی کی تہہ میں جو طوفان کروٹیں لے رہے ہوتے ہیں ان میں ایک بھی ابھر آئے تو سب کچھ تہہ و بالا ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور پھر جو کچھ کیا جاسکتا ہے وہ بھی نہیں ہو پاتا۔

پاکستان کا داخلی ماحول ہو یا مشرق وسطیٰ کا وسیع تناظر ہو، ہم ہر جگہ اور ہر حوالہ سے اس بات پر زور دیتے آرہے ہیں کہ کشیدگی کی موجودگی کو محسوس کیا جائے، اس کے معروضی تناظر کو کھلی آنکھوں سے دیکھا جائے، اس کے اسباب و عوامل کی نشاندہی کی جائے، ان پرفریقین کے سنجیدہ اور ارباب دانش کے درمیان مکالمہ کا اہتمام کیا جائے، ان اسباب و عوامل کو کم کرنے کے امکانات کا جائزہ لیا جائے، ایک دوسرے کے وجود اور جائز حقوق کا احترام کیا جائے، اور ایک دوسرے کی شکایات و تحفظات کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ یہ کام یک طرفہ نہیں بلکہ دو طرفہ بنیادوں پر ہونا چاہیے اور ایسے موثر افراد و طبقات کو سامنے آنا چاہیے جو عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے دونوں فریقوں سے بات کر سکیں، دونوں کو ایک میز پر لاسکیں، حقیقت پسندانہ توازن قائم کر سکیں اور معاملات کو سلجھانے یا کم از کم مزید بگڑنے سے روکنے کے لیے کوئی کردار ادا کر سکیں۔

ہمارے خیال میں مسئلہ کا اصل حل یہی ہے اور اس کے لیے مشرق وسطیٰ کے ماحول میں اسلامی سربراہ کا نفرنس کی تنظیم، جبکہ پاکستان کے اندر عدالت عظمیٰ یا ریٹائرڈ جسٹس صاحبان کا کوئی فورم اس کام کو بطریق احسن سرانجام دے سکتا ہے۔ اگر حکومتی سطح پر یا فریقین کی طرف سے اس کی پذیرائی نہ ہو تو بھی غیر جانبدار دانش وروں کا کوئی فورم اپنے طور پر یہ ذمہ داری قبول کر کے آزادانہ انکوائری اور تحقیقات کے ذریعہ سنی شیعہ کشیدگی میں مسلسل اضافہ کے اسباب و عوامل کی نشاندہی کر کے اس میں کمی لانے کے لیے تجاویز اور سفارشات ملکی اور عالمی رائے عامہ کے سامنے پیش کر سکتا ہے۔ اس سے لوگوں کو اصل صورت حال سمجھنے میں مدد ملے گی اور رائے عامہ کی راہ نمائی ہو جائے گی۔ اور یہ طرز عمل کوئی نئی اور انہونی بات نہیں ہوگی کیونکہ قومی اور عالمی سطح پر تنازعات میں ایسا ہوتا آ رہا ہے اور اس کی افادیت اور تاثیر سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

مثلاً مشرق وسطیٰ کی موجودہ صورت حال کو سعودی عرب اور ایران کے درمیان پر کسی وار سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ اور ظاہری تناظر بھی یہی ہے کہ مشرق وسطیٰ کے نصف درجن کے لگ بھگ ممالک میں یہ کشیدگی آگے بڑھ رہی ہے اور اس کے فروغ کی پشت پر ایران اور سعودی عرب کی موجودگی ہر ایک کو نظر آ رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا موقف یہی ہوگا کہ وہ یہ سب کچھ اپنے دفاع میں کر رہا ہے اور اپنے ہم خیال لوگوں کے تحفظ کے ساتھ ساتھ اپنی سلامتی اور بقا کی خاطر اسے ایسا کرنا پڑ رہا ہے۔ لیکن کیا ان دعوؤں کا زمینی حقائق کی بنیاد پر جائزہ لینا ضروری نہیں ہے؟ سوال یہ ہے کہ زمینی حقائق کیا ہیں، واقعات کی ترتیب کیا ہے، اور ایک دوسرے کے حوالہ سے اقدامات اور پالیسیوں میں توازن و تناسب کیا ہے؟ جب تک ان امور کا جائزہ نہیں لیا جائے گا اور معروضی صورت حال کی پشت پر کارفرما حقائق و اسباب کو سامنے نہیں لایا جائے گا، نہ تو اس کشیدگی بلکہ تصادم کو روکنا ممکن ہوگا اور نہ ہی انصاف کے تقاضے پورے کیے جاسکیں گے۔ دونوں میں سے کسی کو یہ سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس کشیدگی اور تصادم کا فائدہ صرف امریکہ، اسرائیل اور ان عالمی قوتوں کو ہے جو عالم اسلام کو بکھری ہوئی حالت میں رکھنا چاہتی ہیں، جنہیں عالم اسلام میں دینی بیداری اور مذہبی رجحانات کا فروغ برداشت نہیں ہے، جن کا مفاد اسرائیل کے تحفظ و استحکام اور اس کے ذریعہ مشرق وسطیٰ کے

وسائل اور دولت پر اپنی گرفت قائم رکھنے میں ہے، اور جو عالم اسلام کو اس کے اپنے وسائل کے کنٹرول اور استعمال سے محروم رکھنے میں اپنی عافیت سمجھ رہی ہیں۔

لیکن اس کے لیے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہم حالات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیں، اسباب و عوامل کا تعین کریں اور انہیں دور کرنے کے لیے باہمی مکالمہ و مشاورت کے ساتھ راستہ نکالیں۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم سب نے مسائل کے حل کے لیے امریکہ کی طرف دیکھنے کی روش کو عادت بنا لیا ہے۔ ہماری اپنی پالیسیوں کا تعین بھی واشنگٹن کا موڈ دیکھ کر ہوتا ہے۔ اور اسے دولت و طاقت کا کرشمہ ہی کہا جاسکتا ہے کہ امریکہ بہادر بیک وقت حریف بھی ہے، فریق بھی ہے، ریفری بھی ہے، قابض بھی ہے، بچ بھی ہے، گواہ بھی ہے، وکیل بھی ہے، اور فیصلہ صادر کرنے کے بعد سزا دینے کی اتھارٹی بھی وہی رکھتا ہے۔ کیا عالم اسلام کی مثال آپریشن تھیٹر کے اس مریض کی تو نہیں جسے سرجن نے بے ہوش کر کے اس کے پورے جسم کی چیر پھاڑ شروع کر رکھی ہے؟ بات آپریشن کی حد تک رہتی تو کسی حد تک قابل فہم تھی مگر اب تو یہ آپریشن ”پوسٹ مارٹم“ کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے، اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

گزشتہ دنوں دو بظاہر چھوٹی سی خبریں نظر سے گزریں جن کو کسی تبصرہ کے بغیر قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے دوستوں کو ہماری گزارشات کا مقصد سمجھنے میں اس سے کچھ سہولت ہو جائے۔

ایک خبر روزنامہ ”جنگ“ کے ملتان ایڈیشن میں 5 ستمبر کو شائع ہوئی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ:

”ایران کے قونصلیٹ جنرل نے حال ہی میں حکومت پنجاب کی اعلیٰ شخصیات سے ملاقات کر کے انہیں پیش کش کی تھی کہ پنجاب پولیس اور ایران پولیس ایک دوسرے کے تجربات سے فائدہ اٹھائیں تاکہ دہشت گردی کے خاتمہ کے لیے پولیس کو جدید خطوط پر تربیت دی جاسکے۔ ذرائع کے مطابق حکومت پنجاب نے یہ پیش کش قبول کر لی ہے اور فیصلہ کیا ہے کہ سیکرٹری داخلہ پنجاب، آئی جی پولیس پنجاب اور ایڈیشنل آئی جی اسپیشل برانچ پر مشتمل ایک وفد تین روزہ دورے پر ایران جائے گا اور ایران کے پولیس سسٹم کا جائزہ لے گا۔“

جبکہ دوسری خبر روزنامہ ”دنیا“ کے گوجرانوالہ ایڈیشن نے 8 ستمبر کو شائع کی ہے جس کا متن یہ ہے کہ:

”امریکی اخبار ”واشنگٹن ٹائمز“ نے اپنی رپورٹ میں دعویٰ کیا ہے کہ یمن، شام، لبنان اور غزہ کی پٹی میں ایران اپنے حامی جنگجوؤں کو سالانہ اربوں ڈالر کی امداد مہیا کرتا ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ایران وزارت دفاع کا سالانہ بجٹ 14 سے 30 ارب ڈالر کے درمیان ہے جس کا ایک بڑا حصہ بیرون ملک مسلح دہشت گرد گروپوں بالخصوص مشرق وسطیٰ میں سرگرم تنظیموں کو پہنچایا جاتا ہے۔ شام میں بشار الاسد کی حمایت میں لڑنے والے اجرتی قاتلوں کو ماہانہ 500 سے ایک ہزار ڈالر اجرت ایران کی طرف سے ادا کی جاتی ہے۔ ان میں سے بیشتر جنگجوؤں کا تعلق افغانستان اور دوسرے ملکوں سے ہے، پہلے ان کی ایران ہی میں عسکری تربیت کی جاتی ہے۔“

فقہی مسالک کے درمیان جمع و تطبیق

(دارالعلوم ندوۃ العلماء میں کلیۃ الشریعہ کی طرف سے اساتذہ فقہ کے لیے ایک سہ روزہ تربیتی پروگرام منعقد کیا گیا تھا جس میں مولانا سید سلمان حسینی ندوی نے درج ذیل خطاب فرمایا۔ مولوی محمد مستقیم مختتم ندوی نے اس کو کیسٹ سے نقل کیا اور مولانا کی نظر ثانی کے بعد افادہ عام کی غرض سے اسے شائع کیا جا رہا ہے۔)

الحمد لله نحمدہ ونستعينه ونسغفره ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا، من يهده الله فلا مضل له ومن يضلل الله فلا هادي له، ونشهد أن لا اله الا الله وحده لا شريك له ونشهد ان سيدنا ومولانا محمداً عبده ورسوله. صلى الله تعالى عليه وعلى آله واصحابه وأزواجه وذرياته وأهل بيته، وبارك وسلم تسليماً كثيراً، اما بعد!

اساتذہ گرامی قدر، بزرگان محترم، نمائندگان مدارس، دارالافتا ودارالقضاء سے تعلق رکھنے والے فضلاء، اور عزیز طلبہ! اس سہ روزہ تربیتی پروگرام میں جو عنوانات منتخب کیے گئے ہیں، سب اپنی جگہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان عنوانات میں میں سمجھتا ہوں کہ فکر و ولی الہی اور فقہ ولی الہی سے متعلق فقہی مسالک کے درمیان جمع و تطبیق کا موضوع بہت حساس ہے۔ آج تقلید و عدم تقلید کے عنوان سے مسلکی اختلافات شدت اختیار کر چکے ہیں، بلکہ افکار و نظریات اور کلامی مسائل کے اختلافات سے لے کر جماعتی اور سیاسی اختلافات میں شدت پیدا ہوتی چلی جا رہی ہے، جس کے نتیجے میں لوگ ایک دوسرے سے، اور ادارے دوسرے اداروں سے دور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ عالم اسلام میں اس اختلاف نے ایک بڑی مصیبت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ فرقہ وارانہ اختلاف نے میدان کارزار گرم کر دیے ہیں اور ہندوستان کی سرزمین پر اگرچہ مسلک ولی الہی سے تعلق رکھنے والے حضرات ہمیشہ مسلکی توسع اور رواداری کی ترجمانی کرتے رہے، لیکن اس کے باوجود وقتاً فوقتاً اختلافات میں کسی نہ کسی حلقے کی طرف سے شدت پیدا کر دی جاتی ہے۔ ان حالات میں مسالک کے درمیان جمع و تطبیق کی کوشش کرنا، اور فکر و ولی الہی کو اپنے لئے رہنما بنانا بہت ضروری ہے۔

* استاذ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔ انڈیا

اختلاف رائے کے باوجود ہمارے درمیان اتحاد برقرار رہ سکتا ہے، یہ ہنر سیکھنا چاہئے، ہماری روزمرہ کی زندگی میں جماعتی، تنظیمی، اداری اختلافات کی بنیاد پر ہمارے دلوں میں عداوت پیدا نہیں ہونی چاہئے۔

مجتہدین امت اور علمائے ملت فقہی اور کلامی اختلافات کو زحمت نہیں بلکہ رحمت کے طور پر پیش کرتے رہے ہیں ”اختلاف امتی رحمة“ والی حدیث پر اگرچہ کلام ہے، وہ فنی طور پر صحیح درجے کی حدیث نہیں ہے، اور بہت سی حدیثیں ایسی ہیں جو سند کے اعتبار سے صحیح نہیں ہیں لیکن ان کا متن صحیح ہے اور دیگر روایات سے مدلل ہے، کسی بھی حدیث پر حکم لگانے کیلئے محض سند کا مطالعہ کافی نہیں ہے۔ یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ جو متن سند ضعیف کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، اس کی تائید قرآن پاک کی آیات سے، دیگر احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے، صحابہ کرام کے تعامل سے اور مابعد کے علمائے کرام کے اتفاق سے کس درجے میں ہوتی ہے؟ بہت سے ایسے حقائق ہیں جن پر سند کی وجہ سے اشکال پیدا کر دیا گیا ہے، لیکن ان کا مضمون قرآن و حدیث اور علمائے امت کے تعامل سے ثابت ہے۔ ”اختلاف امتی رحمة“ والا مضمون بھی اسی نوعیت کا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی قرآن پاک کی آیات سے، احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے اور صحابہ کے تعامل سے تائید ہوتی ہے اور اس کا بھرپور ثبوت ملتا ہے۔

اختلاف رائے کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک اختلاف مذموم اور ایک اختلاف محمود۔ اختلاف مذموم وہ ہے جس کی بنیاد کتاب و سنت نہ ہو محض کسی کی رائے ہو، یا اجتہاد و قیاس میں حدود سے تجاوز کیا گیا ہو اور بدون دلائل کے کسی مسئلہ کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہو، ظاہر ہے کہ یہ رائے اس لئے مذموم ہے کہ کتاب و سنت کے خلاف ہے، لیکن اگر اختلاف دلائل کی بنیاد پر ہو اور دلائل پیش کرنے والا وہ ہو جس کو استدلال اور استنباط کا حق حاصل ہو تو اس کی تحقیقی کوشش محمود ہے۔ ہاں ہر شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے۔ جس طرح کورٹ میں وکیل کو ہی پیش ہونے کا حق ہے اور جس طرح کرسی جج پر جج ہی بیٹھ سکتا ہے، اور جیسے بیماری میں کسی ڈاکٹر سے ہی رجوع کیا جاتا ہے، محض طبی نسخوں کی کتاب پڑھنے والے کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ علاج و معالجہ شروع کر دے، اور قانون کی کتاب کے مطالعہ سے کوئی جج نہیں بن جاتا۔ اس کو نہ قانونی حق حاصل ہوتا ہے اور نہ علمی دنیا میں اس کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسی طرح فقہی اجتہاد و استنباط کا مسئلہ ہے۔

قرآن پاک اور حدیث کے اپنے طور پر مطالعہ سے اجتہاد کا حق حاصل نہیں ہو جاتا ہے، کسی نے قرآن کا ترجمہ پڑھ لیا ہو، حدیث کی کوئی کتاب دیکھ لی ہو، مثلاً صحیح بخاری کا ترجمہ دیکھ لیا، تو اسے یہ درجہ حاصل نہیں ہوتا ہے کہ وہ اجتہاد شروع کر دے، فیصلہ صادر کرنے لگے، اپنی رائے پیش کرنا شروع کر دے، آج کل عام طور پر طلباء اور مدرسین بھی فقہی اعتبار سے ”عامی“ کے درجے میں ہی ہیں۔ فقہائے کرام نے مجتہد مطلق سے لیکر عامی تک جو طبقات اور مراتب ذکر کئے ہیں، ان کے اعتبار سے مدرسین کا درجہ بھی ایک عامی سے کچھ زیادہ بلند نہیں ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی شخصیت کا جہاں تک تعلق ہے اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ وہ ہندوستان میں علوم اسلامیہ کے مجدد تھے، حضرت مجدد سہروردی نے حکومتی ارتداد کا مقابلہ کیا، اور جھوٹے دین الہی کے مقابلہ میں اسلام کی نصرت و دفاع میں کامیابی حاصل کی، ان کی ایمانی اور روحانی توجہ، اصلاح اور تربیت کے ذریعہ ایسی تبدیلی

وجود میں آئی کہ اکبر کا ارتداد دور جہانگیری میں کمزور پڑ گیا، اور درشاہ جہانی میں وہ ماضی کا ایک حصہ بن گیا، اور بتدریج ہندوستان مجددی کوششوں سے گوارا اسلام بن گیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی چودہ سال کی عمر میں نصایات سے فارغ ہو گئے تھے، اس کے بعد انہوں نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع فرما دیا تھا، وہ دور عام طور پر ہندوستان میں سخت جمود کا تھا، مسلکی تعصب میں بڑی شدت تھی، حقیقت اور شافعییت کی فقہی، کتابی، جنگ تو تھی ہی، بنیادی مآخذ سے رابطہ بھی کمزور پڑ گیا تھا۔ صورت حال یہ تھی کہ قرآن پاک سے یا حدیث نبوی سے اگر براہ راست کوئی دلیل دی جاتی تو بعض لوگ دھڑلے سے کہہ دیتے کہ ہمیں تو امام ابوحنیفہ کا قول چاہئے، ہمیں حدیث نہیں چاہئے۔ شاید وہ ان علماء کی ہدایت کی بنیاد پر کہتے ہوں گے، جنہوں نے ان کو سمجھا رکھا تھا کہ کسی کو اجتہاد کا حق حاصل نہیں ہے، اور آپ براہ راست حدیث سے استدلال نہیں کر سکتے، علم کلام میں ماتریدی اور اشعری نقطہ نظر کے درمیان بھی جنگ و جدل کی فضا تھی اور کوئی اصلاحی تحریک نہیں کام کر رہی تھی، تصوف کے مختلف حلقوں میں بھی خلیج بڑھتی جا رہی تھی۔ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود معرکتہ الاراء مسئلے بنے ہوئے تھے۔ ایسے ماحول میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے قلم اٹھایا اور ”البدور البازغہ“ تصنیف فرمائی، جو ”حجة اللہ البالغة“ کا نقش اول ہے۔ اور ”تہیمات“ میں جو ان کا ایک کٹکول ہے، ان کی ایک علمی ڈائری ہے۔ اس صورتحال پر تبصرے کئے، بلکہ اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے، معاشرے کی بناضی کی، امراض کی نشاندہی فرمائی۔ اس میں انہوں نے کبھی صوفیہ کو خطاب کیا، کبھی علماء کو، کبھی وزراء و امراء کو، کبھی فوج کے جنرلوں کو، کبھی فوجیوں اور سپاہیوں کو اور کبھی عوام کو، ہر طبقہ کی کمزوری کی نشاندہی فرمائی۔ ”تلمیس ابلیس“ میں ابن الجوزی نے جو طرز اختیار کیا ہے اسی سے ملتا جلتا طرز شاہ ولی اللہ دہلوی نے ”تہیمات“ میں اختیار کیا۔

شاہ ولی اللہ دہلوی کی جو سب سے معرکتہ الاراء کتاب ہے جس نے پوری دنیا کے علماء اور اہل فکر و نظر سے خراج تحسین حاصل کیا وہ ”حجة اللہ البالغة“ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک الہامی کتاب ہے، انہوں نے اس میں پورے اسلامی نظام کو ایک مربوط اور منظم شکل میں پیش کرنے کی ایسی پہلی کامیاب کوشش ہے جس کی نظیر دور دور تک نہیں ملتی ہے۔ علامہ شاطبی نے ”الموافقات“ میں اور عز الدین ابن عبدالسلام، غزالی، ابن تیمیہ الحرائی جیسے حضرات نے ان موضوعات پر قلم اٹھایا اور فکر اسلامی کی تجدید اور تشکیل جدید کی کوششیں کی، اور خاص طور پر شریعت اسلامی کے اسرار و حکم کو موضوع بنایا، لیکن جس تفصیل کے ساتھ شاہ ولی اللہ دہلوی نے بارگاہ الہی کے ”ملا اعلیٰ“ سے ریاست کے امراء اور وزراء تک، اور پھر ان سے علماء و صلحاء اور عوام مسلمین تک جس طرح زندگی کے تمام موضوعات عقائد، عبادات، معاشرت، معاملات، اور سیاست اور انتظامی امور وغیرہ پر بحثیں کی ہیں، وہ ایک نادر المثال علمی کارنامہ ہے، جو نہ صرف یہ کہ اپنے مضامین میں بلکہ اپنے اسلوب اور طرز ادا میں بھی منفرد ہے، مولانا منظور نعمانی سے میں نے خود سنا، فرماتے تھے کہ اسلام کو ایسے منظم اور مربوط انداز میں پیش کرنے کا کام شاہ ولی اللہ دہلوی کی علاوہ شاید کسی اور سے نہیں ہو سکا۔ انہوں نے پورے دین کو اس طرح پیش کیا کہ سارے احکام گویا ایک لڑی میں پرو دیئے گئے ہیں۔

شاہ صاحب کا سب سے بڑا مشن ربط و تطبیق و اتحاد کا تھا، انہوں نے عقائد میں سلفیت، اشعریت اور ماتریدیت، فقہ میں شافعییت، حنفیت، مالکییت اور حنبلیت، تصوف میں نقشبندیہ، چشتیت، وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کی شرح میں ابن عربی اور مجدد الف ثانی کو ہم آہم کر دیا، اور ان سب کو شیر و شکر بنا دیا۔ انہوں نے جمع و تطبیق کا جو موقف اختیار کیا اس نے تضاد کو اتفاق سے بدل دیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے تہہمات میں ایک جگہ لکھا ہے کہ میری طبیعت تقلید کے لئے بالکل تیار نہیں لیکن حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مجھ سے مطالبہ کیا گیا کہ میں پابندی قبول کروں۔ فیوض الحرمین، مکاشفات اور مراقبات پر مبنی کتاب ہے، مدینہ منورہ میں دوران قیام جن مراقبات اور مکاشفات سے انہیں نوازا گیا، اس کی روداد انہوں نے اپنی اس کتاب میں درج کی ہے۔ اس میں ایک وصیت یہ بھی تھی کہ تم عمل میں لوگوں کی مخالفت نہ کرو۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے متعدد مقامات پر یہ بات لکھی ہے کہ مجھ سے طلب کیا گیا ہے کہ میں عمل میں اس کی رعایت کروں، تاکہ معاشرے میں کوئی انتشار نہ ہو۔ انہوں نے اس کا ذکر بھی فرمایا کہ جب میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا ہوں تو حنفیت کی پابندی کے ساتھ پڑھتا ہوں، لیکن جب اپنی نماز تنہائی میں پڑھتا ہوں، تو اپنی ترجیحات پر عمل کرتا ہوں، مثلاً رفع یدین کے بارے میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے لکھا ہے کہ رفع یدین اور عدم رفع یدین دونوں ثابت ہیں، لیکن رفع یدین ارجح ہے۔ پھر بھی انہوں نے لوگوں کے سامنے اس پر عمل نہیں کیا ایسے ہی مثلاً وہ وتر کی ایک رکعت، پانچ رکعات یا سات رکعات کے قائل ہیں لیکن عمل مشہور قول پر کرتے رہے، جہراً بسم اللہ پڑھنا، امام کے پیچھے قرأت، عید کی تکبیرات کی تعداد وغیرہ بہت سے موضوعات ہیں جن کے بارے میں ان کی رائے یہ ہے کہ یہ اختلافات صرف ترجیحی بنیادوں پر ہیں، اور سب چیزیں قابل عمل ہیں۔ حضرت شاہ صاحب نے اپنی شرح مسوی اور مصفیٰ میں جا بجا اپنی ترجیحات کا تذکرہ کیا ہے۔ مولانا عبدالحی لکھنوی نے مصفیٰ کے بارے میں لکھا ہے کہ تکلم فیہ کلام المجتہدین اس میں انہوں نے مجتہدانہ گفتگو کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب کے مقدمے میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے فرمایا ہے کہ بندہ ناچیز کو اجتہاد کا ملکہ حاصل ہے۔ اور بھی مختلف مقامات پر انہوں نے اپنے لئے اجتہاد کا دعویٰ کیا ہے، جبکہ کہیں کہیں وہ اپنا تعارف کراتے ہوئے یہ بھی لکھتے ہیں کہ الحنفی مسلکاً و الشافعی تدریساً۔ مسلک کے اعتبار سے اگرچہ میں حنفی ہوں لیکن تدریس میں شافعی ہوں۔

تہہمات میں اس کا بھی ذکر ہے کہ ان سے پوچھا گیا کہ آپ کس طرح مسائل پر عمل کرتے ہیں، تو فرمایا کہ میری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ائمہ اربعہ کے مسائل میں جمع و تطبیق سے کام لوں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ جمع و تطبیق کے کام میں سب سے زیادہ حنفیت اور شافعییت میں جمع و تطبیق کا مسئلہ درپیش آتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے عملی طور پر اس بات کی کوشش کی کہ حنفیت کو شافعییت کے اور شافعییت کو حنفیت کے قریب لایا جائے کیونکہ اگر یہ دونوں مسائل ایک دوسرے سے قریب ہو جاتے ہیں تو پھر زیادہ اختلافات باقی نہیں رہ جاتے۔ مالکییت، حنبلیت اور حنفیت کے درمیان اتنے اختلافات نہیں ہیں جتنے کہ حنفیت اور شافعییت کے درمیان ہیں۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارہ روحانی سے یہ تجویز پیش کی ہے کہ فقہ حنفی کی تجدید کی جائے، اور امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف اور امام محمد کے اقوال کا

احادیث کی روشنی میں جائزہ لیا جائے اور جس کی رائے احادیث صحیحہ کے زیادہ قریب ہو، اسے اختیار کیا جائے۔ اس پر مولانا محمد یوسف بنوری نے اپنے مقالے میں یہ بات لکھی تھی کہ اگر فقہ ولی الہی کی روشنی میں فقہ حنفی کی ترتیب و تدوین حضرت شاہ صاحب کی رائے کے مطابق کی جائے تو پھر حنفیت اور شافعییت کے بمشکل پندرہ بیس مسائل میں اختلافات باقی رہ جائیں گے، اکثر اختلافات ختم ہو جائیں گے۔

اس سلسلہ میں، میں یہ بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اللہ کی کتاب کا جب نزول ہوا اور حضور اکرم کی احادیث جب سامنے آئیں تو وہ نہ حنفی تھیں نہ شافعی، نہ مالکی، نہ حنبلی، قرآن سب کے لئے تھا، حدیثیں سب کے لئے تھیں، علماء و فقہاء کے غور و خوض، تشریح و توضیح اور استنباط و اجتہاد کی بنیاد پر ان کی تحقیقات اور اجتہادات سامنے آئے اور معاشرہ پر ان کے اثرات مرتب ہوئے، اور اپنے اپنے علاقوں میں ان کی چھاپ قائم ہوتی چلی گئی، لوگ ان کا اتباع کرتے چلے گئے، اور فطری طور پر کسی علاقہ میں کسی فقیہ کے فقہ کا رواج ہو گیا، اس میں نہ کسی کی پلاننگ کو کوئی دخل تھا، نہ تعصب اور حلقہ واریت کو۔ امام مالک مدینہ منورہ میں درس دیتے تھے، ان کے شاگردوں کے ذریعہ ان کی فقہ مآراش اور اندلس تک پہنچ گئی۔ مدینہ منورہ اور جزیرۃ العرب میں ان کا مسلک اتنا نہیں پھیلا، جتنا کہ وہ افریقہ کی شمالی پٹی میں پھیل گیا، اسپین میں پھیل گیا۔ امام مالک کے شاگردوں میں بڑے بڑے اجلہ علماء انہیں علاقوں سے اٹھے۔ یہی صورت حال امام ابوحنیفہؒ کی رہی۔ وہ عراق میں رہے، وہاں ان کی شخصیت اور علمی تحقیق کا گہرا اثر ہوا اور پھر ان کے اثرات ایران، خراسان، ترکستان، ہندوستان تک پھیلتے چلے گئے۔ فطری طور پر یہ علاقے متاثر ہوتے گئے، اس میں کسی کی منصوبہ بندی یا پلاننگ کو کوئی دخل نہ تھا، امام شافعیؒ حجاز میں رہے، عراق میں رہے، بعد میں مصر تشریف لے گئے، ان کا مسلک عراق میں پھیلا، شام اور مصر میں بھی پھیلا، امام احمد بن حنبلؒ بغداد میں رہے، ان کا مسلک بغداد میں اور دیگر علاقوں میں محدود طور پر پھیلا۔ ایک طویل عرصے تک ان کا مسلک بہت زیادہ نمایاں نہیں رہا۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ ائمہ ثلاثہ کو فقہاء میں، اور امام احمد ابن حنبل کو محدثین کی فہرست میں شمار کرتے ہیں، اگرچہ وہ ائمہ اربعہ میں ہیں، لیکن حضرت شاہ صاحب ان کے مسلک کو شافعی مسلک کا ضمیمہ قرار دیتے ہیں۔

کتب حدیث میں شاہ ولی اللہ دہلوی نے سب سے زیادہ توجہ ”موطا“ پر فرمائی اور ان کا یہ فرمانا ہے کہ ”موطا“ حدیث کی بنیاد اور اولین کتاب ہے، بخاری اور مسلم اس کی شرح اور تکمیل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ امام بخاری اور امام مسلم کا کام اس شکل میں سامنے آیا کہ انہوں نے احادیث کے بڑے ذخیرے سے اعلیٰ درجہ کی صحیح احادیث کا انتخاب فرمایا۔ امام ترمذی، امام ابوداؤد، امام نسائی، امام ابن ماجہ، امام دارمی وغیرہ حضرات نے اصل کوشش اس پر صرف کی کہ فقہائے کرام کے مستدلات یکجا کر دیئے جائیں، تاکہ فقہاء کی آراء کے ماخذ واضح ہو جائیں، اور یہ واضح کر دیا جائے کہ جو مسلک چل رہا ہے اس کے پیچھے دلائل کیا ہیں اور ان دلائل کی حیثیت کیا ہے؟ امام ترمذی نے اس کا بھی اہتمام کیا کہ دلیل کی حیثیت کو بھی واضح کر دیا۔ حدیث صحیح ہے یا ضعیف، شاذ یا منکر اس کو بھی بیان کیا، اور اس سلسلہ کی دیگر احادیث کی طرف اشارہ بھی کر دیا، ساتھ ہی ساتھ ائمہ فقہاء کی آراء بیان کیں۔

محدثین کرام اور فقہائے عظام نے وقت کی ضرورت اور تقاضے کی تحت اپنے اپنے کام انجام دیئے، ان ائمہ فقہاء میں چار حضرات بہت ممتاز اور نمایاں ہوئے، اور ان کو ایسے شاگرد ملے، جنہوں نے ان کے مسلک کا تعارف کرایا، اور اس کی علمی خدمت انجام دی۔ امام اوزاعی، امام ابوحنیفہ کے درجے کے سمجھے جاتے تھے، اور امام لیث بن سعد، امام مالک کے ہم پلہ قرار دیئے جاتے تھے، لیکن ان دونوں کا مسلک زیادہ نہیں چل سکا، اپنے دور میں ایک بڑی تعداد ان کے مسلک پر عمل کرتی تھی، بہت سے لوگ ان سے فتویٰ لیتے تھے، ان سے رجوع کرتے تھے، لیکن ان کا مسلک رائج نہیں ہو سکا۔ اسحاق بن راہویہ، امام احمد بن حنبل کے معاصر اور برابر کے درجے کے تھے، دونوں فقہ اور حدیث کے امام تھے لیکن امام احمد کے مقابلے میں اسحاق بن راہویہ کا مسلک نہیں چلا۔ عبداللہ ابن مبارک کا مسلک بھی باقاعدہ چلتا تھا، امام ترمذی ائمہ فقہاء میں ان کا بھی حوالہ دیتے ہیں لیکن ان کا مسلک بھی رائج نہیں ہوا۔ ائمہ اربعہ کے ساتھ خدا تعالیٰ کی خاص تائید اور توفیق تھی، اللہ کی طرف سے ان کا انتخاب ہوا، مابعد کی تاریخ سے یہ حقیقت واضح ہوتی چلی گئی۔ امام ابن الصلاح نے اپنی کتاب ”معرفة علوم الحدیث“ میں ائمہ مسلک کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: ائمة المذاهب الخمسة المشهورة۔ اس میں پانچوں مسلک سفیان ثوری کا تھا۔ ابن الصلاح ساتویں صدی ہجری میں تھے، وہ اس وقت کے مشہور پانچ مسلک کی بات کر رہے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے اسلامی قانون سازی کی اور اس کے تسلسل اور فقہ کی تدریجی ترقی کا بڑا منصفانہ جائزہ لیا ہے۔ حضرت شاہ صاحب کی طبیعت میں اعتدال و انصاف کوٹ کوٹ کر بھرا تھا اور جامعیت اور اجتماعیت ان کا مشن تھا، وہ چاہتے تھے کہ ملت کی شیرازہ بندی ہو اور انتشار کو دور کیا جائے۔ بہر حال انہوں نے بارہویں صدی ہجری میں یہ صدالگائی کہ مسلک میں جمع و تطبیق کی ضرورت ہے۔ یہ اس وقت ایک بالکل اجنبی اور نامانوس سی صد تھی، لیکن دھیرے دھیرے، عالم اسلام کے مفکرین اور دعوتی اور اصلاحی کام کرنے والے اب اس رخ پر بڑھتے چلے جا رہے ہیں، یہاں تک کہ دینی مدارس اور علمی حلقوں میں اب یہ مذاکرہ کا موضوع بنا ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم عہد اول کی طرف رجعت اختیار کر رہے ہیں۔ آخری زمانے میں جب حضرت مہدی تشریف لائیں گے، تو وہ نہ حنفی ہوں گے نہ شافعی، نہ مالکی نہ حنبلی، وہ خود مجتہد ہوں گے۔ قرآن پاک اور حدیث نبوی ہی کی بنیاد پر وہ پوری امت کی قیادت فرمائیں گے۔ اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ ان کی آمد کے موقع پر امت مجتمع ہو چکی ہوگی، یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ مسیح بھی ان کی قیادت کو تسلیم کریں گے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت نہ مسلکی اختلافات باقی رہیں گے، نہ کلامی، نہ جماعتی نہ گروہی، اس اجتماعی صورتحال تک پہنچنے کیلئے تدبیری انتظامات بھی چاہئیں، الحمد للہ ہم فکر ولی اللہ کی روشنی میں ان ہی تمہیدی راستوں پر چل رہے ہیں۔

جہاں تک تحریک ندوۃ العلماء اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کا تعلق ہے وہ فکر ولی اللہی کا ترجمان اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے منہج اور طریقہ کار کا علمبردار ہے۔ ۱۹۷۵ء میں جب دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ۸۵ سالہ جشن تعلیمی منعقد ہوا تھا، اس وقت حضرت مولانا سید ابوالحسن ندوی نے ایک بہت بڑے چارٹ پر ایک تحریر عباسیہ ہال کے دروازہ کے

اردگرد آویزاں کروائی تھی جس میں اس بات کی وضاحت کی گئی تھی کہ ندوۃ العلماء اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کا مسلک وہی ہے جو شاہ ولی اللہ دہلوی کا مسلک ہے، اس کا اظہار و اعلان اہتمام سے کیا گیا تھا تا کہ یہ بات تمام حاضرین پر پوری طرح واضح ہو جائے کہ ہم فکر ولی اللہی کے امین ہیں، ہم ان کے شارح و ترجمان ہیں، افسوس ہے کہ اس پر جو کام ہونا چاہئے تھا وہ ابھی تک نہیں ہوا، کتنی عجیب بات ہے کہ کتنی ضروری اور غیر ضروری کتابوں کے ترجمے عربی سے اردو، اردو سے عربی میں کئے گئے، لیکن حضرت شاہ صاحب کا اجتہادی شاہکار ”مصنفی“ شرح ”موطا“ کا ترجمہ نہیں ہوا، اس معرکتہ الراء کتاب میں انہوں نے اصول فقہ کی تشکیل جدید کی طرح ڈال دی ہے اور مجتہدانہ شرح کا ایک نمونہ پیش کیا ہے۔ اپنی آراء اور اجتہادات بھی بیان فرمائے ہیں اور جمع تطبیق کی کوشش کا ایک نمونہ پیش کیا ہے۔ میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے زمانہ طالب علمی سے فکر ولی اللہی کی ترجمانی کی توفیق عطا فرمائی۔ مجھے مولانا علی میاں اور مولانا منظور نعمانی کی صحبتوں میں حضرت شاہ صاحب کے مقام کو سمجھنے کا موقع ملا، پھر ”حجۃ اللہ البالغۃ“ کے درس اور شاہ صاحب کی سوانح اور علمی کارناموں پر متعدد کتابیں پڑھنے کا اتفاق ہوا، الفرقان کے سن ۱۹۴۱ء کے شاہ ولی اللہ پر خاص نمبر کے مطالعہ کا خوب موقع ملا، اور میں نے اپنے فضیلت کے سندی مقالہ کیلئے حضرت شاہ صاحب کے منج فقہی کو اپنا موضوع بنایا، بعد میں یہ مقالہ دو کتابوں میں شائع ہوا، ایک ”تاریخ التشریح الاسلامی و اسباب الاختلافات الفقہیۃ فی ضوء آراء الامام الدہلوی“ اور دوسرا ”التقلید والاجتہاد عند الامام الدہلوی“ کے عنوان سے، ادھر چند سالوں سے دارالعلوم کے دراسات علیا کے طلباء سے حضرت شاہ صاحب کے متعدد رسالوں پر کام کرانے کا موقع ملا، اور موطا کی شرحیں ”مسوی“ اور ”مصنفی“ شائع کی گئیں۔

میری دیرینہ تمنا ”مصنفی“ کے ترجمہ کی تھی، جو الحمد للہ پوری ہوئی، اور فارسی اصل سے عربی ترجمہ دو جلدوں میں مکمل ہو کر شائع ہوا۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے ”فیوض الحرمین“ میں فقہ حنفی کی تجدید یا تشکیل جدید کا جو طریقہ کار بیان فرمایا ہے کہ ائمہ ثلاثہ ابوحنیفہ، ابو یوسف، اور محمد بن الحسن کے اقوال میں اقرب الی الاحادیث الصحیحہ کو اختیار کیا جائے۔ اس پر بھی میں نے کام شروع کرایا تھا، جو ابھی تشنہ ہے۔ حضرت شاہ صاحب ان تینوں کو مجتہد مطلق مانتے ہیں۔ انہوں نے اپنے استاد سے اکثر اصول میں اتفاق کرتے ہوئے بعض اصول اور بہت سی فروع میں اختلاف کیا ہے۔ عام طور پر یہ شہرت ہے کہ وہ مجتہد فی المذہب ہیں، لیکن شاہ صاحب کے نزدیک یہ تینوں مجتہد مطلق ہیں۔ شاہ صاحب کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ کی فقہ کا سرچشمہ حضرت ابراہیم نخعی کی فقہ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ابراہیم نخعی اور ابوحنیفہ کے اقوال کا موازنہ کیجئے تو آپ اس کی تصدیق کریں گے کہ اکثر جگہ امام ابوحنیفہ ابراہیم نخعی سے متفق ہیں۔ اسی طرز پر ابو یوسف اور محمد بن الحسن نے اپنے استاذ گرامی سے استفادہ کیا ہے، ان سے قیاس و اجتہاد سیکھا ہے، اور وہ ان سے اکثر اتفاق کرتے ہیں لیکن بہت سے مسائل میں اختلاف بھی کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر وہ بھی ابراہیم نخعی کی فقہ کو اپنے سامنے رکھتے ہیں، کہنے والوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے، کہ تقریباً دو تہائی مسائل میں دونوں شاگردوں نے امام صاحب سے اختلاف کیا ہے، جس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تقریباً ساٹھ فیصد مسائل میں اختلاف ہے، یہ ایک قابل تحقیق

موضوع ہے۔ امام ابو یوسف کی صحبت مدینہ منورہ کے محدثین و علماء کے ساتھ بھی خوب رہی، اور امام محمد بن الحسن تو باقاعدہ امام مالک کے تین سال شاگرد رہے، ان کی خدمت میں ”موطا“ کی روایت حاصل کی، ان کی شخصیت میں فقہ مالکی اور فقہ حنفی دونوں جلوہ گر ہیں، اگرچہ وہ اصلاً امام ابو حنیفہ کے ترجمان ہیں۔ امام محمد کی ”روایت موطا“ امام مالک کے دیگر شاگردوں کی روایات سے بعض پہلوؤں سے ممتاز ہے۔ انہوں نے اس میں اپنی آراء بھی ذکر فرمائی ہیں۔ بہر حال امام محمد دونوں مدرسوں کے فارغ ہیں۔

اسی طرح امام شافعی بھی دونوں مدرسوں کے فارغ ہیں، وہ ایک طرف امام محمد کے شاگرد ہیں، دوسری طرف امام مالک کے۔ فقہی بصیرت کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ انہیں امام محمد کے مدرسے سے ملی، لیکن حدیث کا خاص ذوق مالک بن انس اور سفیان ابن عیینہ سے ملا، دونوں کے اصول اجتہاد سے استفادہ کرتے ہوئے، انہوں نے اپنے مسلک کے اصول ”الرسالہ“ میں مرتب فرمائے۔ ان کو احادیث کے بڑے ذخیرہ تک پہنچنے کے مواقع حاصل ہوئے اور بہت سی جگہوں پر انہوں نے دونوں مسلکوں سے اختلاف رائے ظاہر فرمایا، میرا یہ خیال ہے کہ امام ابو یوسف اور امام محمد کی آراء اور امام شافعی کی آراء کا موازنہ کرنا چاہئے۔ اور امام شافعی کے اقوال پر اسی طرح غور کرنا چاہئے جس طرح احناف امام ابو یوسف اور امام محمد کے اقوال پر کرتے ہیں۔ امام شافعی اگر امام ابو حنیفہ کی مجلس میں ہوتے، تو ان کی مجلس کے ایک اہم رکن ہوتے، اور ان کو دیگر ارکان مجلس کی طرح اختلاف رائے کا پورا موقع ملتا، وہ اگر بعد زمانی کے ساتھ حاصل ہوا تو اس سے فقہی نظام پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

مسلک جنابلی شاہ صاحب کی نظر میں فقہ شافعی کی ایک شاخ ہے، امام احمد امام شافعی کے شاگرد تھے، انہوں نے فقہ میں ان سے براہ راست استفادہ کیا اور متعدد محقق علماء کے نزدیک ان کی فقہ کے بارے میں وہی رائے ہے، جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی رائے ہے۔

ہمیں فقہائے صحابہ سے فقہائے تابعین تک، اور ائمہ فقہاء سے ان کے شاگردوں تک، اسی طرح ان کی فقہ اور اجتہادی آراء کا جائزہ لینا چاہئے جیسے صحابہ کرام کی احادیث اور آراء بغیر کسی حلقہ واریت اور مسلکی تقسیم کے ہم جائزہ لیتے ہیں، یہ سارے حضرات ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں، ان سب سے استفادہ اسی نقطہ نظر سے ہونا چاہئے۔ بعد کے دور میں جو مسلکی حلقے پیدا ہوئے اور فقہی شخصیات کے الگ الگ حلقے بن گئے، اور پھر ان کے درمیان دوریاں پیدا ہوتی گئیں، یہ حقیقی اسلامی روح کے خلاف ہوا۔ اسلام اس حلقہ واریت کا قائل نہیں ہے، نہ وہ دین و علم کے میدان میں تعصب کی اجازت دیتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ ائمہ اربعہ کی فقہ میں تطبیق و اتحاد کے قائل تھے، کیا ہی اچھا ہو کہ ان تمام ائمہ فقہاء بالخصوص ائمہ اربعہ کی فقہ کو پوری ملت کا مشترک سرمایہ سمجھا جائے، اور سب سے مشترک طور پر استفادہ کی شکلیں پیدا کی جائیں، محدثین کرام کی عظیم علمی کوششوں کو اس میں شامل کیا جائے، اور متفق علیہ باتوں کو ترجیح دی جائے، اور اختلافات کی گنجائش رہنے دی جائے۔ فقہاء احناف میں جنہوں نے تحقیقی احوال اختیار کئے اور احادیث کی روشنی میں اقوال فقہاء کا

جائزہ لیا، ان کی کوششوں کو نمایاں کیا جائے، اور خالص فقہی تخریجات کے پابند اور مسلکی دائرہ میں ”مفتی بہ“ کے طوق سے گلوبند حضرات کے فیصلوں کو بنیادی حیثیت نہ دی جائے۔ اگر امام صاحب کی طویل صحبت میں رہنے والے، ان سے مسلسل استفادہ کرنے والے، اور ان کے عزیز شاگردان سے اختلاف کر رہے ہیں، تو مریدان باصفا ”پیر نہ پرد مریداں می پرانند“ کا مصداق کیوں بنے ہوئے ہیں؟ حق و انصاف کی بات یہ تھی کہ ان حضرات کے اقوال پر غیر جانبدارانہ غور و فکر ہونا چاہئے، پھر ترجیح کا فیصلہ اسی بنیاد پر کیا جانا چاہئے۔ یہ بات اصولاً تو ائمہ فقہاء کے درمیان ترجیحات میں ملحوظ رہنی چاہئے تھی۔ لیکن کم از کم فقہائے احناف میں تو اس کو لازماً ملحوظ رکھنا بہت ضروری ہے۔

خلفائے راشدین کی سنت، ان کے اجتہاد اور رائے کی جب بات آتی ہے تو بعض کم عقل سلفی یہ کہتے ہیں کہ ہمیں عمر کی سنت نہیں چاہئے! ہمیں رسول اللہ کی سنت چاہئے! ظاہر ہے کہ یہ حماقت ”علمی بدویت“ اور ”اہلبی“ کے سوا کچھ نہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر و حضرت عمر کو خاص مقام تشریحی عطا فرمایا ہے، ارشاد فرمایا: اقدسوا بالذین من بعدی ابی بکر و عمر اور تمام خلفائے راشدین کو مجموعی طور پر ایک مقام تشریحی عطا فرمایا ہے۔ ارشاد فرمایا: علیکم بسنتی و سنتہ الخلفاء الراشدین المہدیین عضوا علیہا بالنواجذ۔ حضرت شاہ صاحب نے از الة الخلفاء عن خلافة الخلفاء میں اس موضوع پر بڑی سیر حاصل بحث فرمائی ہے۔

ترتیب یہ ہے کہ سب سے پہلے کتاب اللہ ہے، پھر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، پھر ابو بکر و عمر کی سنت، پھر عثمان و علی کی سنت، پھر اہل بیت نبوی کی سنت اور طریقہ کار، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بسند صحیح ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا: ”ترکت فیکم أمرین لن تضلوا إن تمسکتہم بہما کتاب اللہ و عترتی“ (۱) اس لئے خلفائے راشدین اور اہل بیت نبوی شری طور پر حجت ہیں، یہ موضوع تفصیل طلب ہے، اس وقت صرف اشارہ کر رہا ہوں۔ اس کے بعد اجماع امت ہے، جس میں سرفہرست اجماع صحابہ ہے، جس پر اس آیت سے بھی استدلال فرمایا گیا ہے: ﴿وَمَنْ يَشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصَلِّهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا﴾ ”سبیل المؤمنین“ کو حجت قرار دیا جا رہا ہے، اسی حقیقت کو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے یوں فرمایا تھا ”ما رآہ المسلمون حسنا فہو عند اللہ حسن“ اور حضورؐ کا یہ قول کتب احادیث میں صحت کے ساتھ منقول ہے: ”لا یجتمع امتی علی ضلالۃ و من شذ شذ فی النار“ اور یہ بھی آپ کا ارشاد ہے: ”ید اللہ علی الجماعۃ و من شذ شذ فی النار“ مزید ارشاد ہے: ”علیکم بالسواد الاعظم“۔ لہذا خلفائے راشدین اور اہل بیت کے بعد اجماع علماء امت ہے، اس کو شرعی حجت کے نقطہ نظر سے دیکھنا

(۱) یہ روایت ترمذی، نسائی، مسند احمد بن حنبل وغیرہ صحیح اور حسن سندوں سے موجود ہے، لیکن اہل سنت کے ہاں خلفاء سے راشدین کے ساتھ جو اہتمام ہے اور سنت الخلفاء الراشدین کا جتنا حوالہ دیا جاتا ہے، جبکہ سندی اعتبار سے یہ حدیث زیادہ قوی ہے۔ نہ اس کا حوالہ دیا جاتا ہے اور نہ اس کے ساتھ وہ اعتناء ہے جو ہونا چاہئے، میں سمجھتا ہوں کہ اس کو بھی موضوع بنانا چاہئے۔

چاہئے۔ ہر دور میں علماء کی ذمہ داری ہے اور اہل حق علماء کے بارے میں پیشین گوئی ہے کہ ”یحمل هذا العلم من كل خلف عدوله ينفون عنه تحريف الغالين وانتحال المبطلين وتأويل الجاهلين“ اس لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ان حضرات کی نشاندہی ہو کہ وہ کون سے علماء ہیں جن کے بارے میں حضورؐ پیشین گوئی فرما رہے ہیں، ان کی پہچان اس لئے ضروری ہے کہ وہ معیار حق ہیں گے، ان کا اتباع ہونا چاہئے، انہیں کے بارے میں مزید آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”لا تنزال طائفة من امتی ظاہرین علی الحق لایضربہم من خذلہم الی قیام الساعة“۔ یہ حدیث مذکورہ بالا حدیث کی تائید کر رہی ہے، پھر اور مزید وضاحت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: ”ان اللہ تبارک و تعالیٰ سیبعث علی رأس کل مائة سنة من یجدد لہذہ الامۃ امر دینہا“ اس سے معلوم ہوا کہ ہر صدی میں حضورؐ کی نمائندگی کرنے والے علماء مجددین و مصلحین ضرور موجود رہیں گے۔ یہ حضورؐ کی صاف پیشین گوئیاں ہیں، اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ صرف صحابہ کرام کو ہی ہمیں اپنے سامنے نہیں رکھنا ہے، کیونکہ ہر دور میں نئے مسائل درپیش آتے رہے ہیں، اور آتے رہیں گے، نئے چیلنج سامنے آتے ہیں۔ مقابلہ ہر دور میں باطل سے درپیش رہا ہے اور رہے گا، اس لئے ہر صدی میں تجدید و اصلاح کا کام ضروری ہے، تجدید اجتہاد کی متقاضی ہے، اس لئے ہر صدی میں اجتہاد بھی ضروری ہے۔ مسائل کلامی ہوں یا فقہی، انفرادی ہوں یا اجتماعی، معاشرتی ہوں یا معاملاتی، سیاسی ہوں یا معاشی، ہر دور میں تجدید و اجتہاد کی ضرورت باقی رہے گی، اور اللہ تعالیٰ کی ربوبیت عامہ اس کا انتظام کرتی رہے گی، یہاں تک علم حق مہدی علیہ السلام اپنے ہاتھ میں لے لیں گے۔

بہر حال امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد، اپنی اپنی کوشش کرتے رہے، اپنے نتائج فکر پیش فرماتے رہے اور یہ کہتے رہے کہ ہماری اندھی تقلید نہ کرنا، بے سمجھے بوجھے اتباع نہ کرنا، امام ابوحنیفہ نے فرمایا تھا: کسی شخص کیلئے جائز نہیں کہ وہ میرے قول پر فتویٰ دے جب تک اسے یہ نہ معلوم ہو جائے کہ میری دلیل کیا ہے، یہی بات امام ابو یوسف سے منقول ہے، امام محمد بن الحسن سے منقول ہے، امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور تمام ائمہ سے اس طرح کے اقوال منقول ہیں، ان کے بارے میں تعصب نہ برتا جائے اور ان کی اندھی تقلید نہ ہو۔

جہاں تک عوام الناس کا تعلق ہے، جو ماخذ دین سے ناواقف ہیں، ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ علمائے حق سے رجوع کریں، اور بغیر کسی انتشار کے علماء کی رہنمائی میں عمل کریں۔ ان کا حق یہ نہیں ہے کہ وہ دلائل سے بحث کرنا شروع کر دیں، وہ اس کے اہل نہیں ہیں۔ قرآن کی تفسیر سے واقف نہیں ہے، احادیث کے مضامین، ان کی صحت و عدم صحت، ان سے استنباط کے طریقے سے واقف نہیں ہیں، جس کا بھی یہ حال ہے اس کی حیثیت عوام کی سی ہے، اس کو عالم اور فقیہ سے رجوع کرنا چاہئے۔

بہر حال میں حضرت شاہ صاحب کے نقطہ نظر اور مسلک کا ذکر کر رہا تھا، ان کی اصل کوشش بین المذاہب جمع و تطبیق کی تھی، خاص طور پر حنفیت اور شافعییت میں جمع و تطبیق، اس لئے وہ فرماتے تھے کہ میں عملاً حنفی اور تدریساً شافعی ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ کیوں شوائع و احناف مل کر یہ کام نہیں کرتے، اس کی بہترین جگہ دارالعلوم ندوۃ العلماء ہے، یہاں

شافعی طلباء بھی پڑھتے ہیں اور حنفی بھی ہیں، کیا اچھا ہو کہ حنفی اور شافعی طلباء مل کر یہ علمی کام انجام دیں، اور حضرت شاہ ولی اللہ کی تجویز کو بروئے کار لائیں۔ دونوں مسالک کے اصولوں پر بھی غور ہونا چاہئے اور شروع پر بھی، پھر مالکیہ اور حنفیہ کا تقابلی مطالعہ آسان ہو جائے گا، اور فقہ حنفی و فقہ حنبلی کے درمیان بھی رابطہ واضح ہو جائے گا، اور امت ایک متنفسہ مسلک کی طرف بڑھتی جائے گی۔ ہمیں فقہاء و محدثین کا ادب و احترام ملحوظ رکھنا چاہئے، ان کے ادب و احترام کا اولین تقاضہ ہے کہ ہم ان سب سے مستفید ہوں ان کے علم اور اجتہاد کی قدر کریں، ہم یہ مان کر چلیں کہ، محدثین نے مواد فراہم کیا، اس کی چھان بین کی، اور اس کو بڑی تفصیل کے ساتھ مرتب کر کے پیش کر دیا، ان کی حیثیت عطا کی ہے اور فقہاء کی حیثیت اطباء کی، اطباء کے نسخوں سے حسب ضرورت فائدہ اٹھانا چاہئے اور عطار کی دوکان سے دو لینا چاہئے۔ امام اعظم نے امام اوزاعی سے اور ایک روایت میں یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ سے کہا تھا أنتم الأطباء ونحن الصيدالۃ۔ آپ لوگ ڈاکٹر ہیں اور ہم عطار، ہماری دوکان پر دوائیں موجود ہیں لیکن ہم مرض کی تشخیص نہیں کر سکتے ہیں، نہ علاج بتا سکتے ہیں، یہ کام فقہاء کا ہے۔

فقہی تحقیقات پیش کرنے اور اس کے جامع نظام کو وضع کرنے میں اولیت امام ابوحنیفہ کو حاصل رہی ہے، اس کا امام شافعی نے اعتراف بھی کیا ہے، اور اظہار بھی۔ انہوں نے فرمایا تھا: الناس فی الفقہ عیال علی ابی حنیفۃ، سارے لوگ فقہ میں ابوحنیفہ کے محتاج ہیں، بغیر ان کے فقہ کے اصول و ضوابط سمجھنا اور اجتہاد کے راستے میں چلنا مشکل ہے۔ امام ابوحنیفہ کی قبر کے قریب جو مسجد ہے اس میں ایک مرتبہ امام شافعی نے نماز فجر پڑھائی تو قنوت نہیں پڑھا، ان سے اس کے بارے میں پوچھا گیا کہ آپ تو قنوت کے قائل ہیں، آپ نے قنوت کیوں نہیں پڑھا؟ فرمایا کہ ابوحنیفہ کی رائے کا احترام مانع رہا، ان کی رائے کو میں نے یہاں عملاً ترجیح دی، یہ صاحب قبر کے ساتھ ان کا نایت درجہ کا ادب تھا۔ امام ابوحنیفہ حیات ہوتے تو سوچئے کہ ان کا قدر و محبت کا معاملہ کیسا ہوتا۔ امام ابو یوسف ایک مرتبہ مدینہ منورہ آئے، ایک کنویں کے پانی سے وضو فرمایا، نماز پڑھی، بعد میں کسی نے بتایا کہ کنویں میں چوہا گر گیا تھا، اور آپ کا مسلک تو یہ ہے کہ کنویں کا پانی پاک نہیں رہا۔ فرمایا کہ اس وقت اہل مدینہ کے مسلک پر عمل کر لیتے ہیں۔ امام ابو یوسف جب عید کی نماز پڑھاتے تھے تو خلیفہ عباسی ہارون رشید پیچھے نماز پڑھتے تھے، اور وہ کیونکہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول تکبیرات کو پسند کرتے تھے لہذا امام ابو یوسف ان کی روایت کے مطابق سات تکبیرات پہلی رکعت میں اور ۵ تکبیرات دوسری رکعت میں ادا کرتے تھے۔ اس طرح بہت سی مثالیں ائمہ کرام کے آپس کے لحاظ و اکرام و احترام کی موجود ہیں۔ آج جو تنگ نظری کا ماحول ہے اور جو ایک عرصے سے چل آ رہی ہے وہ درحقیقت عجمیت زدہ ہے، صاف ستھرا عربی ذوق عجمیت سے متاثر ہو کر مگر ہو گیا۔ صحابہ، تابعین، تبع تابعین، اور خود ان کے تبعین کا یہ مزاج نہیں تھا۔

بہر حال میری خواہش یہ ہے کہ فکر ولی اللہی کا تعارف کرایا جائے، امت میں اسے زندہ کیا جائے اور ”حیۃ اللہ البالغۃ“ کو بھی اس نقطہ نظر سے پڑھا اور پڑھایا جائے، یہ حکومت اسلامیہ کے احیاء کے نظام کی ایک زبردست علمی و فکری کوشش و کاوش ہے جس میں شاہ صاحب فکر اسلامی کو پیش کرنے میں پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں۔ ”حیۃ اللہ

البالغۃ، علمائے کرام اور طلباءِ دراساتِ علیا کے مطالعے میں ضرور رُوئی چاہئے، امت کی شیرازہ بندی کے لئے اس کے ذریعہ جو جامع نظام دیا گیا ہے، اس کو بروئے کار لانے کی کوشش کرنا چاہئے، ائمہ کرام کے مسالک پر بے جا تنقید اور منفی رویہ درست نہیں ہے۔

سلفیت کے نام سے جو مسلکی ہنگامہ آرائی کی جارہی ہے، اس کا سلف سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ صحابہ کرام، تابعین عظام اور محدثین و فقہاء کے طریقہ کار کے بالکل خلاف ہے۔ یہ امت میں انتشار برپا کرنے کی ایک سازش ہے، محدثین کرام، اصحاب الحدیث، اہل الحدیث کا طرز دیکھنا ہو تو سنن الترمذی دیکھیں کہ مختلف مسائل کی احادیث کے تذکرہ اور اس صراحت کے بعد کہ یہ یہ حدیث ضعیف ہے، وہ پوری سنجیدگی کے ساتھ اس کے مطالب، فقہاء کرام کے مسالک ذکر کرتے ہیں، اس پر نہ وہ ناراض ہوتے ہیں، نہ فقہاء پر تنقید کرتے ہیں، بلکہ ایک معتبر معمول کی حیثیت سے بغیر کسی تشبیح کے اس کا تذکرہ فرماتے ہیں، یہ اہل حدیث کا طریقہ کار ہے، اسی پر ابوداؤد، نسائی، دارمی وغیرہ کا عمل ہے، لہذا مسلکی اختلاف کی بنیاد پر جماعت بندی، گروہ بندی، اور الگ الگ مساجد کا قیام ایک شیطانی فتنہ ہے، جس پر ملاح کاری کے ساتھ سلفیت کا لبادہ اوڑھا دیا گیا ہے۔ نماز کے مسائل جو روزمرہ پانچ وقت کا اجتماعی عمل تھا اور قدیم صحابہ کرام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے ایک ایک جزئیہ پر عمل کرتے ہوئے تقریباً اٹھارہ ہزار مرتبہ دیکھا تھا، اس میں جتنے بھی اختلافات ان سے منقول ہیں وہ صرف تنوعات ہیں۔ صحابہ کرام کا تعامل اس سلسلہ میں حجت ہے، اور تنوع اور توسع کے ساتھ امت میں یہ تعامل مستقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اس لئے روایتیں تلاش کر کے تعامل کے خلاف فضا بنانا، اور جھگڑا پیدا کرنا کسی طرح درست نہیں ہے، ثناء مختلف الفاظ، بسم اللہ زور سے یا دھیمی آواز سے پڑھنا، امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنا، نہ پڑھنا آئین بلند یا پست آواز سے کہنا، یہ سب جائز صورتیں ہیں۔ امام ترمذی نے اپنی سنن میں ناف کے نیچے، ناف کے اوپر ہاتھ باندھنے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا، ان سب شکلوں میں توسع ہے۔ ان میں کوئی چیز قابل رد نہیں ہے۔ یاد رکھئے کہ آپس کا تفرقہ اور نزاع حرام ہے، یہ چوری اور بدکاری سے بھی زیادہ بڑا جرم ہے۔ آپس کا تفرقہ دین موٹا دینے والا استرہ قرار دیا گیا ہے، اس لئے ہمارے تعلیمی اداروں کو خاص طور پر ان باتوں کا خیال رکھنا چاہئے۔ اکثر مدارس ہی علمی جھگڑوں کا اکھاڑا بن جاتے ہیں، ان کو کلامی اور مسلکی فقہی اختلافات کا ڈنگل بنا دیا جاتا ہے، پھر مساجد اکھاڑا بن جاتی ہیں جس کے نتیجے میں ملت کی اجتماعیت پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔ اس لئے ان علمی و تعلیمی مراکز پر پوری توجہ اصلاح حال کی مرجوز ہونی چاہئے، اور فکر ولی اللہی اور فقہ ولی اللہی کے خطوط پر کام کی داغ بیل ڈالنی چاہئے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں دین کی سوجھ بوجھ عطا فرمائے، ہماری صفوں میں اتحاد فرمائے، اور ہر تفرقہ سے ہمیں محفوظ فرمائے۔
(آئین) و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔



پاکستان کے اسلامی تحقیقی ادارے: جائزہ و تجاویز

[اپریل ۲۰۱۲ء میں ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد نے اپنے یوم تاسیس کے حوالے سے یہ ایک تقریب کا انعقاد کیا جس میں اس طالب علم کو کلیدی خطبہ عرض کرنے کے لئے کہا گیا۔ خیال تھا کہ اس خطبے میں اجمالاً آنے والے نکات کو تفصیل سے بیان کر کے ایک مکمل مقالے کی شکل دے دی جائے۔ بوجہ ایسا نہ ہو سکنے کی وجہ سے تقریباً اسی حالت میں پیش خدمت ہے۔ زاہد]

سب سے پہلے تو میں ادارہ تحقیقات اسلامی کے ذمہ داران، کارپردازان اور جملہ کارکنان کو اس عظیم علمی و تحقیقی سفر کی باون منازل طے کرنے پر دل کی گہرائی سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اسی کے ساتھ ادارے کے ذمہ داران بالخصوص اس کے ڈائریکٹر جنرل ڈاکٹر خالد مسعود صاحب کا تیرہ دل سے شکر گزار ہوں کہ اس پُر مسرت موقع پر اتنی بڑی تعداد میں اہل علم و تجربہ کے درمیان حاضر ہو کر نہ صرف استفادے کا موقع عطا فرمایا بلکہ کچھ عرض کرنے کا اعزاز بھی بخشا۔ ایسے موقع پر کچھ گزارشات پیش کرنا جہاں مجھ جیسے طالب علم کے لئے ایک اعزاز اور سعادت ہے وہیں ایک بڑا امتحان بھی۔ ”حکمت بلقمان آموختن“ والا محاورہ تو بار بار سنا ہے، لیکن جہاں بیک وقت اتنے سارے لقمان موجود ہوں وہاں یہ جسارت کئی آتھ ہو جاتی ہے۔

انیسویں صدی کے نصف یا اس کے اواخر تک کا دور مسلمانوں کے تنزل کی طرف مسلسل سفر کا دور ہے۔ یہ دور مسلمانوں کے زیاں ہی کا نہیں علمی و فکری سطح پر احساسِ زیاں کے فقدان کا بھی ہے۔ سیاسی اور عسکری انحطاط کا کم از کم احساس مسلمانوں میں ضرور موجود تھا لیکن علمی اور فکری تحدیات کا ادراک بہت کم تھا۔ دنیا بہت بدل چکی تھی اور تیز رفتاری سے بدل رہی تھی، خواہی ننخواہی ان تبدیلیوں کے اثرات باقی دنیا کے علاوہ عالمِ اسلام پر بھی مرتب ہو رہے تھے اور ہونے جا رہے تھے۔ لیکن اس دور پر ایک عمومی نظر دوڑائیں تو مسلمانوں کے علمی و فکری حلقوں میں ان تبدیلیوں، ان کے اسباب اور مضمرات کو سنجیدگی سے سمجھنے کی باستثنائے چند کوئی قابل ذکر کوشش نظر نہیں آتی۔ اسلام کے اصول اور اس کی بنیادی تعلیمات تو ابدی اور ناقابلِ تغیر ہیں، لیکن یہ سوال کہ کیا پہلے سے موجود مواد، ڈھانچا اور طور طریقے جو انسانی

* شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد۔ zahidimdadia@yahoo.com

ماہنامہ المشربحہ (۲۲) اکتوبر ۲۰۱۵

کاوشوں کا نتیجہ ہونے کے ناطے زمان و مکان اور حالات کے اسیر ہیں، اس تبدیل شدہ اور مسلسل تبدیل ہوتی دنیا میں اس قابل ہوں گے کہ محض انہی کے سہارے اسلامی تعلیمات کو مسلمانوں کی اجتماعی اور انفرادی زندگی میں رو بہ عمل لایا جائے اس سوال کے جواب کو عموماً ایک عرصے تک قابل اعتنا ہی نہیں سمجھا گیا۔ یہ صورت حال صرف علمی حلقوں کی ہی نہیں تھی بلکہ آخری دور میں مسلمانوں کے اقتدار اعلیٰ کی جو اہم کرسیاں موجود تھیں ان میں بھی بدلتی دنیا کو سمجھنے سے گریز کا انداز ہی غالب رہا۔ مغرب کی طاقت کے گہرے سائے ہندوستان تک پہنچ چکے تھے لیکن یہاں کی مغلیہ سلطنت سمیت طاقت کے بیش تر سرچشموں کو اس چیز کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ اس خطرے کے مضمرات اور اس طاقت کے راز کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کروایا جائے، اس کی بجائے وقت پاس کرنے کے لئے آہستہ آہستہ مقامی طاقتیں سمجھوتوں پر سمجھوتے کرتے اس ابھرتی طاقت کے قدموں کی طرف سرک رہیں تھیں۔ اسی صورت حال کی ایک مثال کے طور پر یہ بات بھی پیش کی جاسکتی ہے کہ مغربی دنیا میں دستور پسندی کا رجحان بہت حد تک نمایاں ہو چکا تھا اور یہ بات بہت موٹے حروف میں نہ سہی بہر حال نوشتہ دیوار تھی کہ باقی دنیا کو بھی آہستہ آہستہ کسی نہ کسی شکل میں ادھر ہی آنا ہوگا۔ اگر اس نوشتہ دیوار کو مناسب وقت پر سنجیدگی سے پڑھ لیا جاتا اور خلافت کو شخصی کی بجائے ایک دستوری ادارہ بنانے کی تجاویز اور کوششوں کا وہ حشر نہ ہوتا جو ہوا تو شاید مسلمانوں کے سیاسی اقتدار اعلیٰ کو وہ دھچکے برداشت نہ کرتے پڑتے جن کا سامنا انہیں کرنا پڑا۔ اس کی وجہ غالباً طویل عرصے تک مسلمانوں کا سیاسی غلبہ تھا، جس کی وجہ سے وہ اپنے قابل شکست ہونے کے تصور کے لئے بھی ذہنا آمادہ نہیں تھے، اس لئے کہ اپنے ماضی کی عظمتوں کی اسیر قوموں کے لئے نئی حقیقتوں کو تسلیم کرنا خاصاً مشکل ہوتا ہے (اس ابتلا کا سامنا اقوام مغرب کو بھی کرنا پڑ سکتا ہے)۔

بہر حال سیاسی طور پر تو عالم اسلام کے ساتھ جو کچھ ہوا سو ہوا، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ جس زمانے سے سیاسی طور پر مسلمانوں کا انحطاط ان کے باقاعدہ دور غلامی میں تبدیل ہونا شروع ہوا تقریباً وہیں سے ان میں علمی اور فکری بیداری کا دور بھی شروع ہوتا ہے۔ اس نئے دور کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ نکتہ بھی بڑا اہم ہے کہ جن حقیقتوں کو بروقت سنجیدگی سے نہیں سمجھا گیا اور ان کا طوطی سر پر چڑھ کے بولنے لگا تو اس کے نتیجے میں جو ذہنی رویے مسلمانوں میں وجود میں آئے ان میں ایک چیز یہ بھی تھی کہ اس دور میں مسلمانوں نے عمومی طور پر فاعلی اور مؤثرانہ کردار (active role) کی بجائے انفعالی اور مؤثرانہ کردار (passive role) کو قبول کر لیا اور انہوں نے یہ باور کر لیا کہ ہم وہ نہیں جو کچھ کرتے ہیں بلکہ وہ ہیں جن کے ساتھ کچھ ہوتا ہے۔ سوال یہ نہیں کہ ہم نے کیا کیا یا کیا کر رہے ہیں بلکہ سوال یہ ہے کہ ہمارے ساتھ کیا ہوا یا ہو رہا ہے۔ اگر کوئی بہتری کی امید کی بات بھی ہے تو اس کا بیان یہ نہیں کہ ہم یہ کریں گے یا کر سکتے ہیں، بلکہ یہ کہ کیسے اور کون نجات دہندہ بن کر آئے گا اور ہمیں بچائے گا اور آگے لے جائے گا۔ اس طالب علم کے خیال میں مسلمانوں کے ذہنی رویوں میں اس پہلو کا تفصیلی مطالعہ خاصی دلچسپی کا حامل ہو سکتا ہے۔ شاید اسی پہلو کا ایک فکری مظہر یہ بھی ہے کہ مثلاً برصغیر ہی میں آزادی کے حوالے سے یا مستشرقین کے ساتھ تعلق کے حوالے سے جو لٹریچر زیادہ مقبول عام ہوا وہ دو طرح کا تھا، ایک وہ جس میں حکم ران قوم سے بنا کر رکھنے کی ترغیب تھی، دوسرے وہ جو اس کے بالکل برعکس سوچ کا عکاس

تھا۔ اول الذکر کے بارے میں تو یہ بات عام طور پر کہی ہی جاتی ہے کہ وہ مرعوب ذہنیت کا شاخسانہ تھا۔ اسی کے ساتھ یہ سوال بھی تحقیق سے وابستہ لوگوں کے قابل توجہ ہے کہ موخر الذکر نوعیت کا جولٹر پیچر اور فکری مواد وجود میں آیا، خاص طور تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات جیسی بڑی تحریکوں کی کوکھ سے جس لٹریچر نے جنم لیا کیا یہ سب کچھ مستقل بالذات تھا یا اس کا بھی کچھ تعلق یورپ ہی کی ان طاقتوں سے تھا جو انگریزوں کے مد مقابل تھیں اور انہیں ہندوستان میں ناکام دیکھنے کی خواہش مند تھیں۔ یعنی کہیں ایسے تو نہیں تھا کہ دونوں قسم کا جو فکری مواد اور لٹریچر وجود میں آ رہا تھا یا عملی سیاست کے میدان میں جو کچھ ہو رہا تھا وہ بھی درحقیقت ہمارے آپس کے مباحثے سے زیادہ یورپ کی بڑی طاقتوں کی جنگ ہی ہم شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنی سر زمین پر لڑ رہے تھے۔ اگر ایسا ہی تھا تو اس سے مزید سمجھا جاسکتا ہے کہ ہم فاعلی (active) کی بجائے کتنے انفعالی (passive) تھے۔

یہاں تو یہ بات ضمناً آگئی، اصل مقصود یہ عرض کرنا تھا کہ مسلمانوں کی سیاسی مغلوبیت بلکہ سیاسی غلامی کے دور سے نئے سوالات زیر بحث آئے جنہوں نے نئی فکری تحریکوں اور رجحانات کو جنم دیا اور اسلامی ادبیات کو ماضی کے ذخیرے کی جگالی اور متون و شروح میں انحصار سے نکال کر اس میں نئی جہات کا اضافہ کیا۔ اس حوالے سے چند میدان یا موضوعات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں سرفہرست تو مغرب کے علوم و افکار کے حوالے سے یہ طویل بحث ہے کہ مسلمانوں کو ان کے ساتھ کیا رویہ اور انداز اختیار کرنا چاہئے، یہ بحث گذشتہ صدی ڈیڑھ صدی کا ہمارا اہم فکری ورثہ اور سرمایہ ہے۔ ان حالات کے نتیجے میں دوسری نوعیت کا اہم مواد وہ ہے جو دنیا کے بڑے مذاہب بالخصوص اسلام اور عیسائیت یا اسلامی تہذیب اور دیگر تہذیبوں کے تقابلی مطالعے کے حوالے سے وجود میں آیا۔ تیسرا اور شاید سب سے اہم میدان جس پر مسلمانوں کے اعلیٰ ترین دماغوں کی توجہ مرکوز رہی وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ تھی۔ اس لئے کہ مسلمان اپنی پسماندگی کو تو دیکھ اور بھگت سکتے تھے لیکن کسی بھی طرح اس کا کوئی ادنیٰ سادھہ یا اس کی ادنیٰ سی ذمہ داری بھی اپنے نبی کی ذات مبارکہ پر یا ان کی تعلیم پر گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے مسلمان مفکرین نے سیرت طیبہ کو نئے انداز سے موضوع بحث بنایا۔ پچھلی صدی ڈیڑھ صدی میں سیرت پر ایسا واقع کام سامنے آیا ہے جو شاید اس سے پہلے کے ہزار سال کے کام پر حاوی ہو۔ چوتھا میدان مطالعہ قرآن تھا۔ اس دور غلامی و پسماندگی نے مطالعہ قرآن کو بھی نئی جہتیں بخشیں اور تفسیر نگاری کے کئی نئے رجحانات متعارف ہوئے۔ پانچواں میدان قانون، معیشت، سیاست وغیرہ پر مغربی علوم و تجربات کا مطالعہ کر کے ان پہلوؤں پر اسلامی نقطہ نظر کی وضاحت تھی۔ اس پانچویں میدان میں زیادہ کام شاید مابعد استعار کے دور میں ہوا اور اس میں مسلمان ملکوں کے ریاستی سرپرستی میں قائم اداروں کا نمایاں حصہ رہا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس دور میں مسلمانوں کی نفسیات میں جہاں passiveness کا عنصر موجود تھا وہیں اس وقت کی صورت حال میں ایک اضطرانی کیفیت بھی موجود تھی، جو کہ مکمل غلامی نے ان میں پیدا کر دی تھی، اور مذکورہ بالا پانچ میدانوں میں جو کام ہوا وہ اسی اضطراب اور بے چینی کی کیفیت کا اچھا ثمر تھا، جس کا یہ مطلب بھی لیا جاسکتا ہے کہ یہ غلامی کا بالواسطہ طور پر ثمر تھا اور یہ کہ غلامی نے مسلمانوں میں خاص قسم کی فکری بیداری پیدا

کی اور انہوں نے ان سے بھی سیکھا جنہیں وہ اپنا حریف سمجھتے تھے۔

تراث کا احیا، اس کی عصری انداز سے پیش کاری، اس کی توضیح و تفسیح اور اس کے تجزیہ و تحلیل جیسے کاموں کو چھوڑ کر اس دور میں ہونے والی تحقیقی اور فکری کاوشوں کے جو مقاصد رہے انہیں تین بنیادی نکتوں میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ سب سے پہلے تو اسلامی تعلیمات کی مغرب پر برتری کو ثابت کرنا، خواہ وہ جارحانہ اور پیش قدمی کے انداز سے ہو یا معذرت خواہانہ۔ اس لئے کہ معذرتی منہج کا مقصد بھی مغرب کو یہ باور کرانا تھا کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو اسلام بھی وہی کہہ رہا ہے اور بہت پہلے سے کہہ رہا ہے، اس لئے اسلام کو تم پر سبقت کا شرف حاصل ہے۔ دوسرا مقصد اس سوال کا جائزہ لینا رہا کہ بدلتی ہوئی دنیا میں زندگی کے مختلف شعبوں میں اسلامی تعلیمات پر عمل کو کیسے ممکن بنایا جائے۔ تیسرے امت مسلمہ جس نے صدیوں تک دنیا کی قیادت کی ہے اسے یہ مقام دوبارہ کیسے حاصل ہو۔

مذکورہ بالا مقاصد کے تحت اوپر ذکر کردہ ہر میدان میں متنوع رجحانات سامنے آتے رہے، جن میں سے بعض تو ایک دوسرے سے بالکل الٹی سمت پر چلتے ہوئے نظر آتے تھے۔ لیکن یہ سب مل جل کر مجموعی طور پر ایک ہی بڑے عمل کا جزو لاینفک ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ پہلی مرتبہ جب اسلام سر بلند ہو رہا تھا اس کی بنیاد بھی علم تھی، جیسا کہ غار حرا میں نازل ہونے والی پہلی وحی سے واضح ہے۔ لیکن اس دور کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ پالیسی کے جزوی معاملات میں بھی اللہ کے نبی کی قیادت سے مسلمان براہ راست سرفراز تھے جنہیں یا تو جزوی معاملات میں بھی اللہ کی طرف سے وحی کی راہ نمائی حاصل ہوتی تھی یا کم از کم فراست نبوت ضرور شامل حال ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ اللہ کی طرف سے عمومی وعدہ؟ نصرت کے ساتھ بعض جزوی مواقع پر بھی نصرت کا خاص وعدہ شامل حال ہوتا تھا (جیسا کہ غزوہ بدر میں ہوا) جس کی وجہ سے اس عمل کی رفتار غیر معمولی حد تک تیز تھی۔ اب اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی بنیاد بھی علم پر ہی ہوگی۔ لیکن ختم نبوت کے نتیجے میں نئی صورت حال کے مطابق سارا کام اس امت ہی کو کرنا ہے، اور اس دنیا کو دارالاسباب سمجھ کر کرنا ہے، اس لئے کہ جس نوعیت کا وعدہ نصرت اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا اس خاص نوعیت کا بعد میں کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اسلام اور امت مسلمہ کی سر بلندی ایک واقعہ یا event نہیں ہوگا بلکہ ایک پروسس ہوگا۔ ایسا نہیں ہوگا کہ کوئی آئے اور چھا جائے، پہلے امت کے حالات کو درست کرے پھر باقی دنیا کو۔ بلکہ ختم نبوت کا ایک لازمی تقاضا ہے کہ ذمہ داری پوری امت پر عائد کی گئی ہے۔ اس لئے سارے پروسس میں امت کی بحیثیت امت شرکت ضروری ہوگی، جس کے لئے یہ ایک لازمی امر ہے کہ مذکورہ بالا مقاصد کے لئے امت کا ہر طبقہ اپنی صلاحیتیں بروئے کار لائے۔ اس کے لئے بحث و فکر اور ڈسکشن کا ایک عرصہ درمیان میں آنا ضروری لازمی ہے اور یہ بھی لازمی ہے کہ اس ڈسکشن میں امت کے مختلف طبقات شریک ہوں۔ انیسویں صدی سے جب سے احساس زیاں اجاگر ہوا ہے تب سے اب تک امت ڈسکشن کے اسی مرحلے سے گذر رہی ہے۔ یہ مرحلہ مزید دراز ہوگا، لیکن یہ عرصہ تنزل کی طرف سفر کے عرصے سے یقیناً کم ہوگا۔ یہ ایک مثبت پہلو ہے کہ امت اگر اقوام عالم میں اپنا مقام بنائے گی تو کسی خاص طبقے کی برتری کے ذریعے نہیں بلکہ ایک طویل ڈسکشن کے نتیجے اور امت کے اجتماعی ضمیر کے ثمرے کے طور پر۔ یعنی بظاہر ایسا

ہوتا نظر نہیں آ رہا کہ کوئی خاص طبقہ آئے اور چھا جائیگی کہ جو راہ بھی ہوگی وہ امت اپنی اجتماعی تجربات اور اجتماعی دانش کی روشنی میں طے کرے گی یا کسی راہ کو قبول کرے گی، ظاہر ہے اس عمل میں وقت لگانا فطری امر ہے۔ بہر حال کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس دور کی طوالت یا متضاد آوازوں کی وجہ سے بظاہر محسوس ہونے والی پراگندگی سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، بلکہ یہ سب کچھ ایک ارتقائی عمل کا لازمی حصہ ہے۔ اس ڈسکشن میں صرف متنوع ہی نہیں متضادات رجحانات کو ایک گھڑی کے کل پرزوں کی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔ ایک گھڑی کو اگر کھول کر دیکھیں تو اس کے مختلف گول گول پرزے ایک دوسرے سے الٹ سمت میں حرکت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن ان سب کی حرکت کا آخری نتیجہ ایک ہی نکل رہا ہوتا ہے اور وہ ہے وقت کی نشان دہی۔

دورِ آزادی میں

جنگِ عظیم دوم کے بعد نئے عالمی حالات کے تحت دیگر ممالک کے ساتھ ساتھ مسلمان ملکوں کو بھی ایک ایک کر کے آزادی ملنے کا سلسلہ شروع ہوا تو متعدد ملکوں میں تحقیقی کام کے لئے ریاستی سطح پر بھی ادارے وجود میں آنے لگے۔ یہاں ہم صرف پاکستان کے تناظر تک بات کو محدود رکھنے کی کوشش کریں گے، جن میں دورِ ادارے خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، ایک اسلامی نظریاتی کونسل اور دوسرے ادارہ تحقیقات اسلامی۔ اس لئے کہ ان دونوں کو دستوری بنیاد حاصل رہی ہے، موخر الذکر کو ۱۹۶۲ء کے دستور میں، اور اول الذکر کو اب بھی حاصل ہے۔ یہاں ان اداروں یا ان جیسے اداروں کی کارکردگی کا تفصیلی جائزہ لینا مقصود نہیں ہے، بلکہ ان کے کام کے چند عمومی خدوخال اور آئندہ کے کام کے لئے چند تجاویز پیش کرنا ہے۔ آج جبکہ ہم ادارہ تحقیقات اسلامی جیسے واقع ادارے کی باون منازل عمر کی تکمیل پر خوشی کا اظہار کر رہے ہیں اور اس کے کارناموں کا جائزہ لے رہے ہیں تو اس موقع پر اس طرح کے اداروں میں نئی زندگی پیدا کرنے کے لئے مناسب ہوگا کہ وقت کی نبض اور رجحانات و امکانات کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامی تحقیق میں نئی جہتیں دریافت کرنے کی کوشش کریں۔ خصوصاً وہ جہتیں جو result oriented ہوں۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہاں دو قسم کے کاموں میں فرق پیش نظر رہنا چاہئے۔ ایک وہ کام ہے جو کیا تو کسی فرد یا چند افراد نے ہوتا ہے البتہ کسی ادارے نے انہیں اس کام کے لئے درکار سہولتیں اور وسائل فراہم کئے ہوتے ہیں یا کسی فرد نے اس ادارے کا حصہ ہونے کے دوران اور اس حیثیت میں کام کیا ہوتا ہے یا اس ادارے نے اس کام کی طباعت و اشاعت کا فریضہ انجام دیا ہوتا ہے۔ دوسری قسم کا کام وہ ہے جو باقاعدہ ایک ٹیم ورک اور اجتماعی کاوش کا نتیجہ ہوتا ہے۔ تعبیر میں سہولت کے لئے آنے والی سطور میں ہم پہلی قسم کے کام کو اداروں کا کام اور دوسری قسم کے کام کو ادارہ جاتی کام کہیں گے۔ دونوں نوعیت کے کاموں میں سے کسی کی بھی نہ تو اہمیت سے انکار کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کام کو کسی ادارے کی حسن کارکردگی میں داخل کرنے سے۔ تاہم کام کے موضوعات اور میدانوں کے انتخاب میں یہ امر مد نظر رکھنا اہم ہے۔ اس لئے کہ بعض کام ایسے ہیں جو صرف موخر الذکر انداز سے ہی انجام پاسکتے ہیں، اس لئے بڑے

بڑے اداروں سے بجا طور پر یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ ان کاموں اور منصوبوں کو اہمیت دیں جن کے لئے دوسری نوعیت کی کاوشیں زیادہ فائدہ مند ہوتی ہیں۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ کون سے موضوعات اور میدان ہائے تحقیق ہمارے تحقیقی اداروں کی توجہ کا زیادہ مرکز رہے ہیں، بالخصوص بات اداروں کے کام کے حوالے سے نہ کی جائے بلکہ ادراہ جاتی کاموں کے حوالے سے کی جائے تو پہلی بات تو یہ سامنے آتی ہے کہ اس تحقیقی کام کا زیادہ تر محور ریاست رہی ہے۔ یعنی یہ سوال رہا ہے کہ ریاست کے کرنے کے کام کیا ہیں اور وہ اپنی ان ذمہ داریوں کو کیسے پورا کرے۔ ان کاوشوں کا بھی شاید سب بڑا محور قانون اور دوسرے نمبر معیشت رہی ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے تو مینڈیٹ میں ہی بنیادی بات یہ تھی۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے بارے میں دستور کی دفعہ ۲۳۰ کی شق (۱) کی ذیلی شق a میں اگرچہ کونسل کا ایک کام یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ ایسی تجاویز تیار کرے جن کے ذریعے مسلمانان پاکستان کو اس قابل بنایا جاسکے کہ وہ اپنی اجتماعی اور انفرادی زندگیوں کو اسلامی ہدایات اور تصورات کے مطابق ڈھال سکیں۔ اس طرح سے اس دفعہ کا یہ حصہ محض قانون کی بجائے بحیثیت مجموعی زندگی کو موضوع بحث بناتا ہوا نظر آتا ہے، لیکن اسی شق میں ان تجاویز کا مخاطب مقتضی کو بنایا گیا ہے نہ کہ منظمہ کو اور یہ کہا گیا ہے کہ کونسل اپنی یہ تجاویز پارلیمنٹ یا صوبائی اسمبلیوں کو پیش کریں گی جن کا بنیادی وظیفہ قانون سازی ہے، اس طرح سے معاملہ پھر قانونی نوعیت اختیار کر جاتا ہے۔ بہر حال اسلامی نظریاتی کونسل اپنے مینڈیٹ کے مطابق اپنے فرائض انجام دیتی چلی آرہی ہے۔ اصل بات جو کہنا مقصود ہے کہ وہ یہ ہے کہ اگرچہ قراہ و مقاصد مختلف آئینی دفعات اور متعدد اہم دستاویزات میں زندگی کو اسلامی ڈھانچے میں ڈھالنے کی بات تو کی گئی لیکن یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ پاکستان بننے کے بعد کی کئی دہائیاں بڑی حد تک اس مفروضے پر لگ گئیں کہ قانون ٹھیک ہو جانے سے سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اس طرح سے زندگی بحیثیت مجموعی ہمارے محققین بالخصوص تحقیقی اداروں کی اتنی زیادہ توجہ حاصل نہ کر سکی جتنی قانون نے حاصل کی۔ پھر قانون خود بھی لوگوں تک انصاف پہنچانے کے نظام کا محض ایک حصہ ہے، جبکہ فراہمی عدل کے عمل کے اور بھی کئی اجزا اور عناصر ہوتے ہیں، یہ اجزا اور عناصر بھی شاید اتنی توجہ حاصل نہیں کر سکے جتنی خود قانون نے حاصل کی ہے۔

ادھر تحقیق کے جو بنیادی مقاصد ذکر کئے گئے ہیں ان میں ایک مقصد اس سوال پر غور ہے کہ موجودہ دور میں انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کو کس طرح اسلامی تعلیمات کے مطابق بنایا جائے۔ اس سوال کے اعتبار سے اب تک کے کام کا زیادہ تر نقطہ ارتکاز ریاست رہی ہے جبکہ ریاست زندگی پر اثر انداز ہونے والا ایک اہم عنصر ضرور ہے اور شاید جدید دور میں ریگولائزیشن کے کردار کی وجہ سے اس کی اہمیت گھٹنے کی بجائے بڑھ رہی ہے تاہم زندگی پر اثر انداز ہونے والا یہ واحد عنصر نہیں، اور بھی کئی عناصر موجود ہیں۔ بالخصوص حالیہ دور میں کئی ایک نے کافی زیادہ اہمیت حاصل کر لی ہے۔ یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ محض ریاست کے کردار کی بھی بات کی جائے تو اس کے زندگی پر اثر انداز ہونے کے دورخ ہیں۔ ایک یہ کہ ریاست کے پاس جبر کی طاقت موجود ہوتی ہے، اپنے اس اختیار کے ذریعے سے وہ لوگوں کو خاص کام کرنے یا نہ کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ قانون کوئی بھی ہو اور کتنا ہی اچھا ہو بہر حال ہوتا ایک جبر ہی ہے۔ ریاست کے

زندگی پر اثر انداز ہونے کا دوسرا رخ ریاستی پالیسی ہے۔ اس زاویے سے ریاست براہ راست لوگوں کو مجبور کرنے کی بجائے عمومی پالیسی ایسی بناتی ہے جس سے خاص ماحول وجود میں آتا ہے اور لوگ خاص رخ پر چلنے لگتے ہیں۔ اب تک ایک طرف تو کام کی زیادہ تر تیز ریاست پر رہی ہے، دوسرے ریاستی کردار میں بھی پہلے رخ کو زیادہ توجہ ملی ہے۔ دوسرے رخ کو خاص توجہ نہیں مل سکی۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہاں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آج کا دور اعداد و شمار، سرویز اور میدانی تحقیق کا دور ہے جس کے ذریعے ایک طرف تو عملی حقائق کو ریاضیاتی اور سائنسی انداز سے معلوم کیا جاتا ہے دوسری طرف کسی بھی اختیار کی جانے والی پالیسی یا اقدام کے ممکنہ اثرات و نتائج کو جانچ کر اس کے بارے میں کافی حد تک درست اندازے لگانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ آج ہر کامیاب پالیسی کے پیچھے شماریات اور میدانی تحقیق کی طاقت موجود ہوتی ہے۔ صرف حکومتیں ہی نہیں کاروباری اور غیر کاروباری ادارے بھی کوئی نیا قدم اٹھانے سے پہلے اس طرح کی سہولتیں مہیا کرنے والے اداروں سے رجوع کرتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس رجحان میں اضافہ ہو رہا ہے اور لوگوں میں یہ احساس بڑھ رہا ہے کہ شماریاتی تحقیق پر مبنی منصوبہ بندی زیادہ کامیاب ہوتی ہے۔ لیکن اسلامی تحقیق شاید اس رجحان سے خاطر خواہ متعارف اور اس سے استفادے کی طرف ابھی مائل نہیں ہو پائی۔ صرف قانونی تحقیق ہی کی بات ہو تو اس میں بھی اس ذریعے کو استعمال کر کے زیادہ نمراؤ و نتائج تحقیق حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ بات تو فقہائے اسلام کے ہاں بھی مسلمہ ہے کہ فقہ کو امر واقعہ سے واقف ہونا چاہئے۔ پورے معاشرے کی سطح پر امر واقعہ کا ادراک کیسے ہوگا، میڈیا کی نمایاں سرخیوں اور ہیڈ لائنز سے، بعض مفاداتی گروہوں کے پروپیگنڈے سے یا شماریاتی ریاضیاتی اور سائنسی طریقہ کار اس کے لئے بہتر ہوگا۔

بہر حال اسلامی تحقیق کے سلسلے میں ادارہ جاتی سطح پر اب تک جو کام ہوا ہے اس کی قدر و قیمت اور اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کام کو آگے بڑھانے کے لئے ایک تو تحقیقی کاموں بالخصوص ادارہ جاتی تحقیق کی ترقی کی ضرورت ہے۔ ریاست یا قانون سے پھیلا کر پوری زندگی کو موضوع بحث بنائے جانے کی ضرورت ہے۔ بالخصوص ہمارے معاشرے اور سماج کو۔ کسی چیز کو قانون بنا کر نافذ کر دینا بہت آسان ہوتا ہے، لیکن اگر یہ سوال ہو کہ اسی چیز کو کسی سماج کے لئے قابل قبول کیسے بنایا جائے، یا نظریاتی اور اصولی طور پر جو چیز اس معاشرے میں قابل قبول ہے کے رو بہ عمل آنے میں حائل رکاوٹوں کو سمجھ کر انہیں دور کیسے کیا جائے تو یہ کام محض قانون سازی کے مقابلے میں خاصا محنت طلب اور وقت طلب کام ہے۔ اس عمل میں کئی نزاکتوں اور سماجی حقائق کو مد نظر رکھنا ہوتا ہے۔

اس حوالے سے یہاں عہد نبوی سے دو مثالیں ذکر کرنے پر اکتفا کروں گا۔ ایک مثال تو یہ ہے کہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ سے مروی ایک روایت کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خواہش تھی کہ فتح مکہ کے بعد بیت اللہ کی از سر نو تعمیر کی جائے اور یہ کہ اس مرتبہ کی تعمیر زمانہ قبل از بعثت کی قریشی تعمیر کی بجائے اصل ابراہیمی بنیادوں اور نقشے (قواعد ابراہیم) پر ہو۔ لیکن نبی کریم کو اندازہ تھا کہ اس کام کے ماحول اور معاشرے پر کیا اثرات مرتب ہو سکتے ہیں،

ان کے پیش نظر آپ نے اس ارادے پر عمل نہیں فرمایا۔ دوسری مثال یہ ہے کہ خاندانی ماحول اور رسم و رواج میں قریش اور انصار کے درمیان بہت سے فرق موجود تھے۔ ہجرت کے بعد جب دونوں طرف کے خاندانوں کا میل ملاپ شروع ہوا، بلکہ ایک دوسرے کے ہاں شادیاں بھی ہوئیں تو پہلے سے موجود ان فروق کی وجہ سے کئی مسائل پیدا ہوئے، ان مسائل و معاملات کو حضور اقدس نے کیسے ہینڈل کیا، یہ مطالعہ حدیث و سیرت کا ایک مستقل موضوع ہے۔ یہاں مثال کے طور پر یہ بات عرض کرنا ہے کہ عربوں کے ہاں گھر بلیو ڈسپلن قائم رکھنے کے لئے عورتوں کو مارنا ایک عام ہی بات تھی۔ خصوصاً قریش میں انصار کے مقابلے میں یہ چیز زیادہ تھی۔ جبکہ انصار میں مردوں کی عورتوں پر اتھارٹی کم تھی۔

اسلام کا اصل مزاج تو یہ ہے کہ کسی جانور کو بھی بلاوجہ نہیں مارنا چاہئے، اپنے غلاموں اور باندیوں تک کو مارنے پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت وعیدیں ارشاد فرمائیں۔ ایک موقع پر جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو مسعود انصاری کو دیکھا کہ وہ اپنے ایک غلام کو مار رہے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ ابو مسعود! یہ ذہن میں رکھو کہ جتنا بس تمہارا اس غلام پر چلتا ہے اس سے زیادہ قدرت اللہ تعالیٰ کو تم پر حاصل ہے۔ یہ بات سن کر ابو مسعود انصاری نے اس غلام کو فوراً آزاد کر دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم ایسا نہ کرتے تو تمہیں دوزخ کی آگ میں جھلسنا پڑتا۔ حالانکہ ابو مسعود بدری صحابی ہیں، اور بدر میں شرکت ایسی نیکی ہے جس کی وجہ سے اللہ کی طرف عام مغفرت کا وعدہ ہے۔ جب ایک زر خرید غلام یا باندی کو مارنے کے بارے میں اسلام کا مزاج یہ ہے کہ تو شریک حیات کے بارے میں اس کی تعلیم کیا ہو سکتی ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔

غلاموں کو مارنے پر پابندی کا اطلاق تو بہت آسانی سے ہو گیا لیکن جب عورتوں کا معاملہ آیا تو کچھ پیچیدگیوں کا بھی سامنا ہوا۔ ابتدا میں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنی طور پر اس سے منع فرمادیا۔ لیکن اس پر بعض لوگوں کی طرف سے یہ شکایت سامنے آئی کہ اب تک چونکہ جو ڈسپلن چلا آ رہا تھا اس میں مار پر پابندی نہ ہونے کا بھی دخل تھا، اب یک دم پابندی لگنے سے معاملات درست نہیں رہے۔ روایات کے لفظ ہیں کہ عورتیں جری اور بے باک ہو گئی ہیں۔ آں حضرت نے عارضی طور پر یہ پابندی اٹھالی۔ اس پر ان عورتوں کی طرف سے شکایات کا تانتا بندھ گیا جو زمانہ جاہلیت سے اگرچہ مارتہتی چلی آ رہی تھیں، اب چند دن انہوں نے اس مار پر پابندی کا مزا چکھ لیا تھا۔ اس موقع پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ عورتوں کی طرف سے اپنے مردوں کے خلاف اس طرح کی شکایات بکثرت آ رہی ہیں، جن مردوں کے بارے میں اس طرح کی شکایتیں آ رہی ہیں وہ کوئی اچھے لوگ نہیں ہیں۔ گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس فرمایا کہ مقصود اگرچہ بڑا ہے، لیکن اس کے حصول کے لئے اخلاقی راستہ اختیار کرنا زیادہ بہتر ہوگا۔

یہاں بذات خود اس مسئلے پر بات کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ یہ عرض کرنا ہے کہ اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسی موثر ہستی موجود ہو اور صحابہ جیسے اطاعت شعار لوگ موجود ہوں وہاں بھی سماجی اور معاشرتی حقیقتیں اپنا اثر کس طرح دکھاتی ہیں اور کسی تبدیلی کے لئے کس طرح سے تدریجی طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ سماج کا سدھار اول تو ہماری توجہ کا مستحق بنتا ہی کم ہے، اگر بن جائے تو اسے کسی تحقیقی کاوش کا محتاج سمجھنے کی

بجائے محض واعظانہ کام سمجھ لیا جاتا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات پر عمل درآمد کے سلسلے میں جب ہم سماج کو موضوع تحقیق بنائیں گے وہاں خاصا کام کرنے کی ضرورت ہوگی۔ اس لئے کہ بحیثیت مجموعی انسانی معاشرے کی حرکیات اور رویے ہوتے ہیں۔ کسی چیز کو کوئی معاشرہ اپنے اندر کیسے جذب کرتا ہے، اپنی اختیار کردہ قدروں، رسم و رواج یا عادات کو کب کیوں ہر قیمت پر سینے سے لگانے کی کوشش کرتا ہے اور کب اپنی اختیار کردہ چیزوں ہی کو dispose off کر دیتا ہے، نئی چیزوں کو کب کیسے اور کیوں قبول کرنے کے لئے لپکتا ہے اور کب کیسے اور کیوں کسی نئی چیز کے بارے میں ہچکچاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ سب باتیں وہ ہیں جنہیں سمجھنا سماج پر مبنی اسلامی تحقیق کے لئے اسی طرح ضروری ہے جس طرح متعدد شعبوں میں فقہ اسلامی سے واقفیت کے ساتھ موجودہ قوانین جاننے کو ضروری سمجھا جاتا رہا ہے۔ پھر ہر ماحول اور سماج کا اپنا الگ مخصوص مزاج اور رنگ ہوتا ہے اس کا مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔

سماجی سطح پر اسلامی نقطہ نظر سے جو بھی کام ہوگا اس کا محور معروف اور منکر کے تصورات ہوں گے۔ ایسے کام کے کئی زاویے ہو سکتے ہیں۔ اطلاقی اور عملی تحقیق سے پہلے کچھ اصولی سوالات پر کام اہم ہوگا۔ مثلاً معروف اور منکر کا معیار کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سب سے اہم معیار تو نص ہے۔ لیکن اس کے علاوہ معروف اصول، رآہ المسلمون حسناً فہو عند اللہ حسن کے مطابق خود مسلمان معاشرے کو اس کے طے کرنے میں ایک کردار دیا گیا ہے، اس کی حدود کیا ہیں۔ پھر عملی اور اطلاقی پہلو سے کئی چیزیں دیکھنے کی ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ وہ کون سے معروف ہیں جنہیں کسی خاص اور متعین ماحول میں قابل قبول قدر کا درجہ حاصل ہونا چاہئے تھا لیکن حاصل نہیں ہے، یا کون سا منکر ہے جس کے منکر ہونے کا احساس ایک خاص ماحول میں موجود نہیں ہے۔ اس کے اسباب کیا ہیں۔ اور اس کے تدارک کے لئے کیا کیا تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں۔

دوسرے یہ کہ وہ کون سے معروف ہیں جو کسی ماحول میں سمجھے تو معروف ہی جاتے ہیں یعنی نظر یاتی طور پر ایک اچھی قدر کے طور پر متعارف ہیں، لیکن اس کے عملی اثرات نظر نہیں آتے، یا کسی منکر کو نظر یاتی طور پر منکر تو سمجھا جاتا ہے لیکن عملاً اس ماحول یا معاشرے میں اس کا وجود عام نظر آتا ہے۔ اس کے اسباب کی کھوج لگانا، کہ ایک کام کو اچھا سمجھتے ہوئے لوگ اسے کیوں نہیں کر پارے یا برا سمجھتے ہوئے اس سے کیوں نہیں بچ پارے۔ اسباب کی کھوج لگانے کے بعد اس کے تدارک کے ذرائع سوچنا۔

تیسرے یہ کہ معاشروں کے ایک دوسرے ساتھ میل ملاپ اور دیگر محرکات کے نتیجے میں ان کے طرز زندگی بلکہ طرز فکر میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ کبھی یہ تبدیلیاں خود آ رہی ہوتی ہیں اور کبھی پیدا کی جا رہی ہوتی ہیں۔ ان پر نظر رکھنا اور ان کے بارے میں مناسب پالیسی طے کرنا۔ یہ کام اتنے سادہ نہیں ہیں کہ انہیں یا تو وعظ و نصیحت کے شعبے پر چھوڑ دیا جائے یا چند لٹھ بردار گروہوں کے رحم پر۔ یا پھر ایسے گروہوں کی خدمت کو کافی سمجھ لیا جائے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ کام اداروں کی سطح پر ٹیم ورک کے طور پر سائنسی بنیادوں پر کرنے کے ہیں۔ اس میں جہاں شمار یاتی اور میدانی تحقیق سے کام لینے کی ضرورت ہے وہیں انسانی رویوں کے علوم (Behavioural Sciences) سے بھی گہرے استفادے کی

ضرورت ہے۔ اس سے بھی پہلے اسلامی مصادر بالخصوص سیرت طیبہ کی روشنی میں سماجیات پر اثر انداز ہونے یا ان کے ساتھ کوئی رویہ روار کھنے کے طور طریقوں کے بارے میں بنیادی اصول متعین کرنا ہوں گے۔ پھر سارے تحقیقی کاموں کو بنیاد بنا کر ریاستی ادارے، میڈیا، تعلیمی اداروں، تفریح سازوں، ادبا وغیرہ زندگی پر اثر انداز ہونے والے تمام طبقات کے لئے آسان گائیڈ لائن تیار کرنا ہوگی۔

یہ سوال اسلامی تحقیق کاروں کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمارے معاشرتی ریشے اور بافتے صرف کمزور ہی نہیں ہو رہے، ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہم آدھا تیر آدھا ٹیر بننے کی بجائے تیر نہ ٹیر والی صورت حال کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ معاشرے میں کیا قدریں مروج ہونی چاہئیں، کیا چیز سماجی طور پر قابل قبول ہونی چاہئیں کیا نہیں اس حوالے سے کہیں غلطیاں پیدا نہیں ہو رہی ہیں کہ یہ کام کسی منصوبے، سوچ، بچار، مباحثے وغیرہ پر مبنی ہونے کی بجائے ان چیزوں کو چند سوشل پلیٹرز مثلاً میڈیا، یا میڈیا کے بھی ایک حصے اشتہار راتی صنعت کے حوالے کر دیا ہو، وہ چاہے تو کچھ عرصے میں معاشرے کے لئے ایسی چیزوں کو بھی قابل قبول بنا دے جو کچھ عرصہ قبل ناقابل قبول تھیں۔

ہمارے ہاں یہ شکایت بکثرت کی جاتی ہے کہ مغرب یا فلاں فلاں طاقتیں یا لایا بیایا ہمارے معاشرے میں فلاں فلاں غلط چیزوں کو بڑی منصوبہ بندی سے فروغ دے رہی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر ایک کام ایک انسانی گروہ کر سکتا ہے تو دوسرا کیوں نہیں کر سکتا۔ اگر انسانی معاشرے، اس کے رویوں اور اس کی سوچ میں غلطی کاشت ہو سکتا ہے تو اچھا ختم کیوں کاشت نہیں ہو سکتا۔ مذہب اور سماجیات کے باہم ملاپ پر مبنی تحقیق کی روایت غالباً مغرب میں موجود نہیں ہوگی، اس لئے کہ وہاں مذہب صرف نمائش رہ گیا ہے لیکن کیا ہمارے مغربی نمونے کے بغیر کوئی نئی تحقیقی روایت قائم کرنا ممنوع ہے؟ بات شاید وہی ہے کہ ہم بحیثیت مجموعی اپنے لئے فاعلی کردار کی بجائے انفعالی کردار (passive role) قبول کر چکے ہیں۔ اگر اس سے نکلنے بھی ہیں تو active یا proactive ہونے کی بجائے reactive ہو جاتے ہیں۔ یہ باتیں تو بطور مثال عرض کی جا رہی ہیں۔ اصل مقصود یہ کہنا ہے کہ اسلامی تحقیق کے ایک اہم مقصد اسلامی تعلیمات کو آج کی زندگی میں رو بہ عمل لانے کے سلسلے میں اب تک جو کام ہوا ہے اس کے دائرہ کار میں وسعت کی بہت زیادہ گنجائش موجود ہے۔

اس ضمن میں ایک اور چیز کی طرف اشارہ کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں ایک چیز تزکیہ بھی ذکر کی ہے۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکارم اخلاق کی تکمیل کو اپنی بعثت کا مقصد قرار دیا ہے۔ جس کا حاصل صوفیہ کرام کے مطابق اخلاقِ رذیلہ کی اصلاح اور اخلاقِ فاضلہ کو انسان میں راسخ کرنا ہے۔ یہ کام یقیناً ہماری خانقاہوں اور مشائخ نے انجام دیا ہے اور اب بھی کسی حد تک چل رہا ہے۔ لیکن کیا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا یہ مقصد صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو خود کو کسی خانقاہ سے وابستہ کرتے ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے، بلکہ دین کی اساس ہونے کے ناطے یہ پورے مسلم معاشرے کی ضرورت ہے تو پھر ظاہر ہے کہ اس کام کو خانقاہوں، تصوف کے سلاسل اور وعظ و نصیحت کی مجالس تک محدود کرنے کی

بجائے اس مقصد کے لئے عام زندگی پر اثر انداز ہونے والے تمام عناصر کو استعمال کرنا ہوگا۔ یہ کام کیسے ہو سکتا ہے، اس کے لئے بھی مذکورہ بالا نوعیت کے تحقیقی کام کی ضرورت ہے، جو صرف لائبریری تحقیق تک محدود نہ ہو بلکہ عملی، میدانی اور شماریاتی تحقیق پر مبنی ہو اور اس میں رویوں کے علوم (Behavioural Sciences) کی راہ نمائی بھی مفید ہو سکتی ہے۔ صوفیہ کرام افراد کی اصلاح کرتے ہوئے جب کسی ردیہ کی علامت اپنے کسی مرید میں دیکھتے تھے تو یہ جاننے کی کوشش کرتے تھے کہ اس کا منشا اور سبب کیا ہے، اسے دریافت کر کے علاج کیا کرتے تھے۔ آج بھی کام بحیثیت مجموعی پورے معاشرے پر بھی ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم اگر دیکھتے ہیں کہ لوگوں میں غصہ کنٹرول کرنے اور ضبط و تحمل سے کام لینے کی صلاحیت کم ہے تو ہم اس حوالے سے متعلقہ مہارت رکھنے والے اداروں کے تعاون سے شماریاتی ڈیٹا جمع کر سکتے ہیں کہ عموماً کن کن مواقع پر لوگ جلدی سے ایک دوسرے سے الجھ پڑتے ہیں، اس معاملے میں جنس، عمر، تعلیم، معاشرتی طبقات وغیرہ کے حوالے سے کیا کیا فرق پائے جاتے ہیں۔ کس کس طرح کے لوگوں میں کن کن مواقع پر یہ چیز زیادہ دیکھنے میں آتی ہے۔ اس کی وجوہات کیا ہوتی ہیں۔ کون کون کس طرح سے اپنے جذبات پر نسبتاً بہتر کنٹرول کر لیتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کا ڈیٹا اگر موجود ہو اور اسے استعمال کرنے کا سلیقہ بھی موجود ہو تو عام زندگی کو بھی ایک خانقاہ بنایا جاسکتا ہے۔ حاصل یہ کہ معاشرے کو سمجھنے کے لئے میدانی معلومات، شماریاتی تحقیق اور انسانی رویوں اور سماجیات سے بحث کرنے والے علوم کی مدد سے پورے معاشرے کی تربیت کے بڑے بڑے منصوبے بنائے جاسکتے ہیں۔

اگر خالصتاً ریاست کے حوالے بھی بات کی جائے تب بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں عموماً دو رجحان پائے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ ریاست کو اس طرح کے معاملات میں بالکل غیر جانبدار رہنا چاہئے، دوسرا رجحان یہ ہے کہ اس مقصد کے لئے ریاست کو اپنا اختیار جبر بھر پور انداز سے استعمال کرنا چاہئے اور حسب بل جیسے قوانین لاگو ہونے چاہئیں۔ جبکہ ایک تیسرا راستہ بھی ہو سکتا ہے کہ ریاست اپنے جبر نہیں اپنی پالیسی کے ذریعے یہ کام کرے۔ یہ کام اگرچہ زندگی پر اثر انداز ہونے والی ہر طاقت کر سکتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ ریاست کے پاس زندگی پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت سب سے زیادہ نہیں تو کافی زیادہ ہوتی ہے۔

بہر حال یہ ایک خوشی کا موقع ہے ادارہ تحقیقات اسلامی جیسا واقع ادارہ اپنی عمر کے باون سال پورے کر رہا ہے۔ اس موقع بس یہ حقیر سی طالب علمانہ خواہش پیش کرنا مقصود ہے کہ پاکستان کے تحقیق اداروں میں اب تک ہونے والے کاموں کے جائزے کے ساتھ نئے تحقیقی راستوں کی تلاش بھی جاری رہنی چاہئے۔

مدارس کی اصلاح: ایک اور کمیٹی!

قوم کو یہ مژدہ ہو کہ مدارس کی اصلاح کے لیے دو کمیٹیاں مزید بنادی گئی ہیں۔ انسانی یادداشت تو شاید اس کی متحمل نہ ہو سکے، کوئی کیلکولیٹر ہی بتا سکے گا کہ اب تک اس کارِ خاص کی بجا آوری کے لیے کتنی کمیٹیاں بنائی جا چکی ہیں۔ وزیر داخلہ نے مکرر ارشاد فرمایا کہ مدارس اور علمائے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں شاندار کردار ادا کیا ہے۔ سادہ سا سوال یہ ہے کہ اگر کوئی بڑی شکایت نہیں ہے تو یہ پے در پے کمیٹیاں کس لیے؟ ایسا غیر معمولی اجلاس کیوں جس میں وزیر اعظم کے ساتھ آرمی چیف اور ڈی جی آئی ایس آئی بھی شریک ہیں۔ ایک معمولی سی بات کے لیے اس سطح کے لوگوں کو زحمت دینے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ یہ معمولی کام تو وزیر داخلہ کے حکم پر، ان کی وزارت کا معمولی اہل کار بھی نمٹا سکتا تھا۔

خیر یہ امور جہاں بانی، ہم جیسے عامی کیا سمجھیں۔ بڑے دماغوں کا کام بڑوں ہی کے لیے چھوڑتے ہوئے، میں ایک بات کو موضوع بنانا چاہتا ہوں جو اعلیٰ سطحی اجلاس سے چھن کر باہر آئی۔ کہا گیا کہ جب اصلاح مطلوب ہے تو صرف مدارس ہی کی کیوں؟ پورے تعلیمی نظام کی کیوں نہیں؟ میرا خیال ہے جس نے بھی یہ بات کہی، اس کی بصیرت کی داد دینی چاہیے۔ یہ سچ ہے کہ اصلاح صرف مدارس کی نہیں، تعلیم کے سارے نظام کی ضرورت ہے۔ اگر یہ مقدمہ درست ہے تو پھر تعلیم کو ایک اکائی کے طور پر دیکھنا پڑے گا۔ پھر دینی اور دنیاوی کی تقسیم غیر ضروری ہے۔ پھر تو معاملے کا سارا تناظر ہی بدل جائے گا۔

مدارس کیوں ضروری ہیں؟ ہم سب جانتے ہیں کہ مدارس اُس علمی ورثے کی حفاظت کے لیے وجود میں لائے گئے تھے، انگریزوں کی آمد کے بعد، جس کے ضائع ہونے کا خدشہ پیدا ہو گیا تھا۔ یہ خدشہ بے بنیاد نہیں تھا۔ مدارس نے اپنے ذمہ دو کام لیے۔ ایک یہ کہ ایسے علمائے تیار کیے جائیں جو روایتی علوم کے ماہر ہوں اور یوں اس روایت کو زندہ رکھیں۔ دوسرا یہ کہ سماج کی دینی ضروریات پوری کریں۔ مسلمان گھرانوں کو وہ معلم میسر آئیں جو ان کے بچوں کو دینی تعلیم دے سکیں۔ ان کی مساجد کو آباد رکھیں اور یہ کہ موت اور پیدائش سے متعلق دینی رسوم ادا کی جاسکیں۔ آزادی کے بعد لازم تھا کہ ریاست یہ ذمہ داری اٹھا لیتی۔ اس نے ایسا نہیں کیا۔ یوں یہ روایت نجی سطح پر برقرار رہی کیونکہ ضرورت باقی

تھی۔ ریاست کی اس لائق نے مذہب کی ایک معیشت کو جنم دیا۔ یوں ایک طبقہ وجود میں آیا جس کی معاش اس سے وابستہ ہوگئی۔ ۱۹۷۹ء کے بعد جب ریاست کو افغانستان میں ایک محرکہ درپیش ہوا تو اس نے ان مدارس کو ایک نرسری سمجھا اور یوں ان کی مدد سے افغانستان کی جنگ کے لیے رضا کار تیار کیے اور وہ مبلغ بھی جو ریاست کے تصور جہاد کو پھیلا رہے تھے اور مزید رضا کار تیار کرنے میں ریاست کے مددگار تھے۔

اس کے نتیجے میں جو کچھ ہوا، اسے بارہا دہرایا جا چکا۔ قصہ مختصر کہ اب ریاست اس کام کو سمیٹنا چاہتی ہے، جسے اس نے ۱۹۷۹ء کے بعد پھیلا دیا تھا۔ اس باب میں ریاست سے دو بنیادی غلطیاں ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ آزادی کے بعد اس نے مسلم آبادی کی دینی ضروریات سے صرف نظر کیا۔ دوسرا یہ کہ افغانستان کی جنگ میں اس نے ان مدارس کے سماجی کردار کو یکسر تبدیل کر دیا۔ پہلے ان کا کام سماج کی دینی ضروریات کی تکمیل تھا۔ اب انہیں ریاست کے سکھائے ہوئے تصور دین کا مبلغ بنادیا گیا اور ساتھ ہی رضا کاروں کی فراہمی کا کام بھی سونپ دیا گیا۔ ریاست ہی نے وہ ماحول فراہم کیا جس کے ذریعے، مذہبی سیاسی جماعتوں نے، طلباء تنظیموں کے زیر اہتمام، اس تصور دین کو جدید تعلیمی اداروں تک پہنچا دیا۔ اب اس تصور دین کے مبلغ اور رضا کار دونوں طرح کے تعلیمی اداروں میں موجود تھے۔ افغان جنگ سے لے کر القاعدہ تک، سب کو زیادہ جان نثار، جدید تعلیمی اداروں سے ملے۔ اس کے لیے اگر آج کسی مردانہ پورے نظام تعلیم کی اصلاح کی بات کی تو اس نے غلط نہیں کہا۔

اس خرابی نے چونکہ ریاست کی غلطی سے جنم لیا، اس لیے لازم ہے کہ وہی اس کو درست کرے۔ ایک تو وہ سماج کی دینی ضروریات کی تکمیل کی ذمہ داری اٹھائے۔ دوسرا یہ کہ تعلیمی نظام کو ایک سمت دے اور اس سے دوئی کو ختم کرے۔ میں اس کے لیے چند اقدامات تجویز کر رہا ہوں:

- ۱۔ ملک میں بنیادی بارہ سالہ تعلیم کا یکساں نظام قائم کیا جائے۔ تمام بچوں کے لیے یہ تعلیم لازم ہو۔
- ۲۔ بارہ سالہ تعلیم کے بعد تخصص کا آغاز ہو۔ آج جس طرح میڈیکل، انجینئرنگ اور دوسرے شعبوں کے ماہرین تیار کرنے کے لیے خصوصی تعلیم کے کالج قائم ہیں، اسی طرز پر دینی تعلیم کے ماہرین کی تیاری کے لیے ادارے قائم ہوں جہاں پانچ سال تک دین کی تعلیم دی جائے۔
- ۳۔ حکومت جس طرح ڈاکٹرز، انجینئرز کو ڈگری دیتی ہے اسی طرح دینی تعلیم کے ماہرین کو ڈگریاں جاری کرے۔ ان کو بھی اسی طرح تنخواہیں اور مراعات دی جائیں، جیسے دوسرے شعبے کے لوگوں کو دی جاتی ہیں۔
- ۴۔ مرکزی سطح پر ایک محکمہ قائم کیا جائے جو سماج کی دینی ضروریات کا خیال رکھے۔ مسجد، مکتب اور دیگر دینی ذمہ داریوں کے لیے افراد کا انتخاب کرے اور ان کی تعیناتی کرے۔ اس کے لیے ترکی کے ادارے دیانت کو مثال بنایا جا سکتا ہے۔

۵۔ اس وقت جو دینی مدارس تخصص اور اعلیٰ تعلیم کی شہرت رکھتے ہیں، انہیں اسلامی یونیورسٹی کا درجہ دے دیا جائے۔ ان کا نظم بھی دیگر یونیورسٹیوں کی طرح ایچ ای سی (HEC) کے پاس ہو۔ نجی سطح پر اعلیٰ دینی علوم کے لیے

یونیورسٹیاں قائم کرنے کی اجازت ہو جس طرح آج دیگر علوم کے لیے جامعات قائم ہو رہی ہیں۔
۶۔ دیگر تمام مدارس کو بارہ سال کی عمومی تعلیم کے اداروں میں بدل دیا جائے۔ اساتذہ میں جواہل ہیں، انہیں ریفرنڈم کو سز کرائے جائیں اور انہیں وہی سکیل دیے جائیں جو اس وقت دیگر اساتذہ کو دیے جاتے ہیں۔ جو اپنی تعلیم کو بہتر بنانا چاہیں، انہیں اس کا موقع دیا جائے۔ عام اساتذہ کی طرح ان کی بھی تبدیلی اور ریٹائرمنٹ ہو۔
۷۔ تمام تعلیمی اداروں میں سیاسی اور مذہبی جماعتوں کا داخلہ ممنوع ہو، انہیں طلباء و نگرانے سے روک دیا جائے۔ اداروں کی انتظامیہ کو پابند کیا جائے کہ طالب علموں کی دینی اور دیگر ضروریات کا خیال رکھے۔ جیسے مسجد کا قیام اور مروجہ اخلاقی روایات کی حفاظت۔

۸۔ اتحاد تنظیمات المدارس کے ذمہ داران کی مشاورت سے اس سارے نظام کی تشکیل نو کی جائے اور اس کے لیے تدریج کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ جن مدارس کو عمومی تعلیم کے اداروں میں بدلنا ممکن نہ ہو تو انہیں مکتب بنا دیا جائے، جن کی حیثیت قبل از تدریس (Pre-Schooling) اداروں کی ہو۔
۹۔ حکومت علما کی تائید حاصل کرنے کے لیے، یہ منصوبہ آرمی چیف اور ڈی جی آئی ایس آئی کی موجودگی میں ان کے سامنے رکھے۔ انشاء اللہ برکت ہوگی۔

کیا یہ سب کچھ ہو جائے گا؟ میرا جواب ہے: 'نہیں'۔ ارباب اقتدار اور پیور کریسی میں یہ صلاحیت موجود نہیں۔ ان کی قوت پرواز ہم دیکھ چکے جو اسلام آباد کے نظام صلاۃ تک ہے۔ نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ اس کام کے لیے سماج اور مذہب کا مطالعہ ضروری ہے۔ یہ اہل اقتدار کے نصاب میں شامل ہیں نہ افسر شاہی کے۔ اگر میں اس کو لا حاصل سمجھتا ہوں تو لکھ کیوں رہا ہوں؟ اس کا میرے پاس ایک ہی جواب ہے: وما علینا الا البلاغ
(بشکریہ روزنامہ "دنیا")

مقالاتِ ایوبی

رنصحاتِ قلم: مولانا قاضی محمد روئیس خان ایوبی

چند عنوانات: ○ منافع خوری کی حد اسلامی نقطہ نظر سے ○ عدالتی فسخ نکاح کی شرعی حیثیت ○ زنا غیر مستوجب حد میں مجرم کو تعزیری سزا ○ عوامی مفاد کے لیے قبرستان اور مسجد کی جگہ کا استعمال ○ واقعہ کر بلا تاریخ کے آئینے میں ○ طلبہ کے سوالات و اشکالات اور ارباب مدارس کا رویہ

ناشر: الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ

صفحات: ۲۳۶۔ قیمت: ۲۵۰ روپے

ماہنامہ الشریعہ (۳۵) اکتوبر ۲۰۱۵

وزیر اعظم ہاؤس میں اجلاس

۷ ستمبر کو وزیر اعظم ہاؤس اسلام آباد میں وطن عزیز کی اعلیٰ سیاسی و دفاعی قیادت کا دینی مدارس کی پانچ تنظیمات کے قائدین کے ساتھ ایک اہم اجلاس منعقد ہوا۔ اجلاس میں وزیر اعظم جناب محمد نواز شریف، مسلح افواج کے سپہ سالار جناب جنرل راجیل شریف، وزیر داخلہ چوہدری ثار علی خان، ڈائریکٹر جنرل آئی ایس آئی جنرل رضوان اختر، وزیر مذہبی امور سردار محمد یوسف اور وزیر تعلیم بلخ الرحمن کے علاوہ اہم وزارتوں کے اعلیٰ افسران شریک ہوئے۔ دینی مدارس کی تنظیمات کے قائدین کے اسماء گرامی میڈیا پر آچکے ہیں۔ اندر کا ماحول خوشگوار تھا۔ باہمی اعتماد اور احترام کی فضا تھی۔ کوئی تناؤ نہیں تھا اور اگر اس میں طے شدہ امور پر لفظاً و معنی عمل ہوا تو ان شاء اللہ العزیز اس کے یقیناً مثبت نتائج برآمد ہوں گے۔ لیکن پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے مہربان دوستوں نے اپنی خواہشات کو خبر بنا کر آتش بداماں سرخیاں لگائیں اور بحث مباحثے کی مجالس ٹیلی ویژن اسکرین پر برپا ہو گئیں۔ پیرزادہ قاسم صدیقی نے کہا ہے:

شہر کرے طلب اگر تم سے علاج تیرگی

صاحب اختیار ہو، آگ لگا دیا کرو

اجلاس کے بعد وزیر داخلہ جناب چوہدری ثار علی خان کی پریس کانفرنس متوازن تھی، لیکن اگر شروع و حواشی کے ساتھ خبر میں مصالحو ڈال کر تزکا نہ لگایا جائے تو بات نہیں بنتی۔ ہمارے ایک مہربان صاحب قلم جو گہرائی تک جاتے ہیں اور بین السطور کا بھی مطالعہ کرتے ہیں، انھوں نے اس اجلاس کو مایوس کن قرار دیا اور اسے ریاست کی کمزوری قرار دیا۔ ریاست کی کمزوری پر الگ سے بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے، مگر پھر کبھی۔ میڈیا کے دوستوں نے یہ تاثر دیا کہ گویا چیف آف آرمی اسٹاف اہل مدارس کی مشکلیں کسنے اور انھیں بیڑیوں میں جکڑنے کے لیے آئے تھے۔ غالب نے کہا ہے:

تھی خبر گرم غالب کے اڑیں گے پرزے

دیکھنے ہم بھی گئے تھے یہ تماشا نہ ہوا

ہماری مسلح افواج کے سپہ سالار جناب جنرل راجیل شریف ایک مشکل اور پیچیدہ جنگ کی قیادت کر رہے ہیں۔ یہ ملک کی سرحدوں کے اندر ریاست سے برسر پیکار مفسدین کے خلاف جنگ ہے اور بیک وقت شہروں اور دشوار گزار قبائلی علاقوں میں برپا ہے۔ زیندر مودی انتہائی جارحانہ انداز اختیار کیے ہوئے ہے۔ افغانستان کو تو وہ العیاذ باللہ پاکستان کی

شکست و ریخت کے لیے پہلے ہی مرکز بنائے ہوئے تھے، لیکن متحدہ عرب امارات میں ہمارے مہربان دوستوں نے اپنی تمام تر روایات کے برعکس مودی کے لیے جلسہ عام کا اہتمام کیا جس میں صرف پاکستان کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اس سے پاکستان کو یہ پیغام دینا مقصود ہے کہ گوادر چائنا اقتصادی شاہراہ انھیں کسی طور پر گوارا نہیں ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ میں سعودی عرب اور ایران کے مابین اپنے دائرہ اثر کے پھیلاؤ کے لیے سرد جنگ جاری ہے اور یمن میں تو گرم جنگ بھی چلا ہے اور متحدہ عرب امارات سعودی عرب کی ”خلیج تعاون کونسل“ کا سب سے اہم شراکت دار ہے، لیکن اسے مودی کی جاوگری کہیے کہ بیک وقت اس کی قریبی ایران اور سعودی عرب و متحدہ عرب امارات کے ساتھ قائم ہیں، یعنی اپنے مفاد میں اس نے آگ اور پانی کا ملاپ کر رکھا ہے۔ واضح رہے کہ انڈیا گوادر ایئر پورٹ کو غیر موثر بنانے کے لیے ایران کی بندرگاہ چاہ بہار کو ترقی دینے کے لیے اپنے خزانے کی تجوریاں پہلے ہی کھول چکا ہے۔

ان حقائق کے باوجود ہمارے میڈیا کے مہربان کیا یہ چاہتے ہیں کہ ملک کے اندر نئے نئے محاذ کھلیں اور ہماری مسلح افواج چوکھی لڑائی میں پھنس جائیں اور اصل ہدف کو سانس لینے اور اپنی حکمت عملی از سر نو ترتیب دینے کا موقع مل جائے؟ ہماری رائے میں حب الوطنی کا تقاضا یہ ہے کہ جنگ کے سپہ سالار کو اپنی حکمت عملی اور ترجیحات خود طے کرنے کا موقع دیا جائے اور قوم کے تمام تر طبقات ان کی غیر مشروط حمایت کریں، ان کی پشت پر کھڑے ہوں تاکہ پتا چلے کہ یہ قومی جنگ ہے اور قوم پورے عزم کے ساتھ اسے کامیابی کی منزل تک پہنچانے کے لیے یک سو ہے۔ سندھ میں کرپشن کے خلاف کارروائی سے بعض سیاسی عناصر پہلے ہی مضطرب اور تنج پائے ہیں، اس لیے حکمت اور ٹھہراؤ کے ساتھ معاملات سے نمٹنے کی ضرورت ہے۔

میں نے اپنی گفتگو میں کہا کہ ہمیں طویل تقاریر کی بجائے اصل مسئلے پر گفتگو کرنی چاہیے اور وہ یہ ہے کہ ریاست کو ہم سے کیا چاہیے اور ہم ریاست سے کیا چاہتے ہیں؟ گزشتہ ڈیڑھ عشرے سے تو اتر کے ساتھ جو اصطلاحات ہم سنتے چلے آ رہے ہیں اور ہمیں ازبر ہو چکی ہیں، وہ یہ ہیں: فرقہ وارانہ منافرت، فرقہ وارانہ تصادم، شدت پسندی، انتہا پسندی اور سابق صدر جناب جزل پرویز مشرف کے تحائف میں سے آزاد خیالی، روشن خیالی اعتماد پسندی شامل ہیں۔ جہاں تک مسالک کی خلافیات کے بارے میں علمی ابحاث کا تعلق ہے، وہ اکیڈمک ہیں اور ان کا تعلق کلاس روم اور درس گاہ سے ہے۔ ان کا عوامی اجتماعات سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ دینی لٹریچر قرون اولیٰ سے چلا آ رہا ہے اور دنیا کی تمام یونیورسٹیوں اور درس گاہوں میں موجود ہے۔ اس نے ماضی میں کبھی بھی ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے کے لیے مسلح جھٹھے پیدا نہیں کیے اور نہ ہی مذہب و مسلک کی بنیاد پر قتل و غارت کا بازار گرم رہا ہے۔ یہ رجحان کب پیدا ہوا، کیوں پیدا ہوا، اس کے قومی اور بین الاقوامی محرکات کیا تھے، یہ لوگ کہاں پائے جاتے ہیں، ان کے ٹیکنیکی اور مالیاتی ذرائع کہاں ہیں؟ ان امور کو ریاستی ادارے ہم سے بہتر جانتے ہیں۔ ریاست ان کے خلاف جو بھی کارروائی کرے گی، ہم ریاست کے ساتھ کھڑے ہوں گے، ان کے حمایتی نہیں ہوں گے۔

ہم پانچوں تنظیمات کی طرف سے یہ متفقہ تحریر دے چکے ہیں کہ اگر ریاستی اداروں کے پاس شواہد ہیں کہ کوئی ادارہ یا مدارس سے متعلق بعض افراد کسی بھی ملک دشمن سرگرمی میں ملوث ہیں تو ان کے خلاف شواہد کی روشنی میں جو بھی کارروائی

کی جائے گی، ہم ان کا کوئی دفاع نہیں کریں گے اور ریاست کے ساتھ کھڑے ہوں گے، لیکن حال ہی میں ہمارے اعلیٰ شہرت کے حامل عصری تعلیمی اداروں کے بعض طلبہ کو دہشت گردی کی کارروائیوں میں ملوث ہونے پر گرفتار کیا گیا ہے اور ایسی بہت سی اور مثالیں بھی ہیں تو کیا اس کی بنیاد پر ان اداروں کو دہشت گرد قرار دے دیا جائے گا؟ اب تو مغربی تعلیمی اداروں سے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں داعش اور القاعدہ میں آ کر شامل ہو رہے ہیں اور ان میں سے بعض یمن، عراق و شام اور وزیرستان میں ڈرون حملوں کا نشانہ بھی بن چکے ہیں۔ سو یہ ایک ذہنی سوچ اور فکری رویہ ہے جو ذہنوں میں جنم لے رہا ہے اور اس کے من جملہ محرکات میں ذہن سازوں کی مہارت کے ساتھ ساتھ عالمی سطح پر نا انصافیاں اور جدید آئی ٹی دور میں مظالم کی داستانوں کی سوشل میڈیا پر تشہیر بھی ہے۔

میں نے یہ بھی تجویز پیش کی کہ الیکٹرانک میڈیا پر مسلمی خلافت کے بارے میں مناظرانہ بحث مباحثے پر پابندی لگائی جائے۔ یہ ایک دم مباحث ہیں اور انھیں کلاس روم تک محدود رہنا چاہیے۔ اسی طرح عام اجتماعات میں نفرت انگیز خطابات پر پابندی لگا کر اسے قابل تعزیر جرم قرار دیا جائے اور گلی کوچوں و محلوں میں ہر قسم کے جلسوں پر وقت کی پابندی کا اطلاق کیا جائے۔ ساری رات لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے دور دور تک لوگوں کو پریشان کرنا، نیند سے محروم کرنا، مطالعے میں مصروف طلبہ یا مربیوں کو بے چین کیے رکھنا شرعاً درست نہیں ہے اور اسے قانون کے دائرے میں لانا ضروری ہے۔ لہذا ہر مذہبی یا سیاسی جلسے کی اجازت انتہائی وقت کے تعین کے ساتھ مشروط ہونی چاہیے۔

ہمارے بعض دوستوں کی یہ خواہش ضرور ہے کہ کشتوں کے پستے لگیں، پورے منظر کو تہ و بالا کر دیا جائے، مگر انھیں احساس ہونا چاہیے کہ ملک کسی انقلابی عمل سے نہیں گزر رہا۔ داخلی فساد اور مفسدین کے خلاف جنگ اور کربش کی تطہیر کی مساعی نظام کے اندر رہ کر ہو رہی ہیں اور نظام کی محدودیت کا ہر ایک کو ادراک ہونا چاہیے۔ فوجی عدالتوں کے لیے بھی نظام کے اندر گنجائش پیدا کی گئی ہے۔ ہمارے ایک مہربان دوست نے لکھا کہ مدارس کا معاملہ پھر نامعلوم شروعات کی بھول بھلیوں میں دفن کر دیا گیا ہے، حالانکہ ۲۰۱۰ء کا معاہدہ معقول تھا اور اسی کو آگے بڑھانا چاہیے۔ اس سے قطع نظر کہ اس وقت یہ معاہدہ ہمارے میڈیا کے پر جوش دوستوں کو ایک آنکھ نہیں بھایا تھا، مگر آج اس کی پسندیدگی پر ہم تبدل سے ان کا شکر یہ ادا کرتے ہیں اور انھیں یقین دلاتے ہیں کہ معاملہ وہیں سے آگے بڑھے گا جہاں پر رکا تھا۔ یہ ریاست اور ہم سب کے مفاد میں ہے۔ باقی امور پر پھر گفتگو ہوگی۔ ہمارے ایک مہربان دوست تکرار کے ساتھ یہ کہتے رہتے ہیں کہ ان چند لوگوں کے ساتھ ہی بات کیوں کی جاتی ہے۔ گویا ”ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں“۔ ہمیں ان کی بھاری جسامت اور وزن کا احساس ہے، لیکن تلخ حقائق کو قبول کرنے ہی میں عافیت ہے۔ ملک کا نظام چلانے والے، حساس معاملات پر نظر رکھنے والے اور پاکستان کے دینی مدارس کے غم میں گھلنے والی بیرونی قوتیں خوب جانتی ہیں کہ ملک کے اٹھانے والے فی صد مدارس کا نظم ان ہی پانچ تنظیمات کے ساتھ مربوط ہے۔ لہذا جب بھی سنجیدہ مکالمے کی نوبت آئے گی، انھی ”بے وزن“ لوگوں کے ساتھ بات کرنی پڑے گی۔ یہ ان کی ترجیح نہیں بلکہ ضرورت ہے۔ اور اگر کوئی ہمارے ان دوستوں کے ساتھ مکالمہ کر کے نظم میں کوئی بہتری لاسکتا ہے تو بصد شوق ایسا کرے، ہمیں کوئی شکایت نہیں ہوگی۔

(بشکر یہ روزنامہ دنیا، لاہور)

امام ابن جریر طبریؒ کی جلالت - چند مزید باتیں

”مستشرقین کے ایک بڑے طبقے کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اسلامی شریعت، مسلمانوں کی تاریخ اور تہذیب و تمدن میں کمزوریوں اور غلطیوں کی تلاش و جستجو میں وقت صرف کریں، اور سیاسی و مذہبی اغراض کی خاطر رائی کا پر بت بنائیں۔ اس سلسلے میں ان کا کردار بالکل اس شخص کا سا ہے جس کو ایک منظم و خوشنما اور خوش منظر شہر میں صرف سیوریج، نالیاں، گندگی اور گھورے نظر آئیں، جس طرح محکمہ صفائی کے انچارج کسی کارپوریشن اور میونسپلٹی میں منصفی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ اس طرح کی رپورٹ پیش کرے جس میں طبعی طور پر قارئین کو سوائے گندگیوں اور کوڑے کرکٹ کے تذکرے کے عام طور پر کچھ نہیں ملتا۔“

۱۹۸۲ء میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر منعقدہ عالمی سیمی نار میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے پیش کردہ یہ کلمات نہ جانے کیوں ہمارے ذہن میں بار بار گردش کر رہے تھے جب محترم کالم نگار جناب اوریا مقبول جان صاحب کے امام طبریؒ پر مرکوز کالموں پر ہماری نظر پڑی تھی۔ پھر ان پر ہمارے ایک وضاحتی مضمون (مطبوعہ ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ شمارہ ستمبر ۲۰۱۵ء) پر ان کا رد عمل مزید پریشانی کا باعث بنا۔ دنیا کی وسعتوں کو دیکھنے والے کالم نگار نے اس رد کے ذریعے ہماری معلومات میں اضافہ یا ان کی تصحیح کی ہے۔ ممکن ہے اس کا سبب ہمارا فہم ناقص ہو، جس نے تازہ کالم سے ہماری معلومات میں اضافہ کا احساس نہ ہونے دیا ہو اور ہمیں اس میں حسیب جالب مرحوم کے مصرعے ”میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا“ کی گونج سنائی دی ہو۔ ان کا جوابی کالم پڑھ کر ہمیں محسوس ہوا کہ فاضل دانشور نے ہمارے مضمون کو ٹھنڈے دل سے پڑھنے کی کوشش نہیں کی ہے، بس پتہ نہیں موصوف نے یہ کیوں مان لیا کہ خود وہ حد سے گذر جائیں تو معاف ہے، اگر وہ کسی خالص علمی اور فنی بحث کو عامۃ الناس میں لے جائیں تو اخلاص اور دانشمندی کی انتہا ہے۔ جب وہ ایک امام وقت کے لیے ایسا بل و لہجہ استعمال کریں جو اہل علم کا شیوہ نہیں تو درست، لیکن جب کاٹ خود ان پر پڑے تو تلملا اٹھیں۔ اسے انصاف نہیں کہا جاسکتا!

ہم نے اپنے مضمون میں یہ بات کہی تھی کہ: ہماری بہت سی متعدد محترم شخصیات کے امام طبریؒ کے تئیں غلط فہمی پر مبنی

* بھٹکل، انڈیا۔ ammuniri@gmail.com

موقف اختیار کرنے کا سبب یہ ہے کہ چونکہ یہ علمی شخصیات مغربی سامراج کے دور عروج میں ابھریں تھیں، تو یہ لاکھ انکار کریں لیکن ان پر مستشرقین کے اسلوب نقد سے مرعوبیت چھلکتی ہے اور یہ فطری بات ہے کہ ان کے مخاطب یہی تو لوگ تھے۔ انہی کے اسلوب میں انہی کے اعتراضات کا توڑ پیش کرنا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ موصوف بھی کبھی کبھار مستشرقین کے اسالیب سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ علامہ شبلی نے سیرت النبیؐ کے مقدمہ میں مستشرقین کے انداز تحقیق کے بارے میں لکھا ہے کہ:

”سیرت نبویؐ کے واقعات جو قلم بند کئے گئے وہ تقریباً نبوت کے سو سال بعد قلم بند ہوئے، اس لئے مصنفین کا ماخذ کوئی کتاب نہ تھی، بلکہ اکثر زبانی روایتیں تھیں۔ اس قسم کا موقع جب دوسری قوموں کو پیش آتا ہے یعنی کسی زمانے کے حالات مدت کے بعد قلم بند کئے جاتے ہیں تو یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ ہر قسم کی بازاری افواہیں قلم بند کر لی جاتی ہیں۔ جن کے راویوں کا نام و نشان تک معلوم نہیں ہوتا۔ ان افواہوں میں سے وہ واقعات انتخاب کر لئے جاتے ہیں جو قرآن قیاسات کے مطابق ہوتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد یہی خرافات ایک دلچسپ تاریخی کتاب بن جاتے ہیں، یورپ کی تاریخی تصنیفات اسی اصول پر لکھی گئی ہیں۔“

کیا یہ حقیقت نہیں کہ مستشرقین یورپ نے سیرت کو بھی اپنے اسی معیار پر رکھا، اور اپنے ہی معیارات کے مطابق سیرت پاک میں کیڑے نکالنے لگے؟ کالم نگار نے بھی انہی معیارات کو درست سمجھ کر جن مورخین سیرت نے امانت داری اور غیر جانب داری سے واقعات نقل کئے تھے، انہیں مورد الزام ٹھہرا دیا حالانکہ ان کی نظر سے علامہ شبلی نعمانی کی یہ عبارت گزرنی چاہیے تھی کہ:

”لیکن مسلمانوں نے اس فن سیرت کا جو معیار قائم کیا، وہ اس سے بہت زیادہ بلند تھا۔ اس کا پہلا اصول یہ تھا کہ جو واقعہ بیان کیا جائے، اس شخص کی زبان سے بیان کیا جائے جو خود شریک واقعہ نہ تھا تو شریک واقعہ تک تمام راویوں کا نام بہ ترتیب بتایا جائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی تحقیق کی جائے کہ جو اشخاص سلسلہ روایت میں آئے، کون لوگ تھے؟ کیسے تھے؟ کیا مشاغل تھے؟ چال چلن کیسا تھا؟ حافظہ کیسا تھا؟ سمجھ کیسی تھی؟ ثقہ تھے یا غیر ثقہ؟ سطحی الذہن تھے یا دقیقہ بین؟ عالم تھے یا جاہل؟ ان جزئی باتوں کا پتہ لگانا سخت مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ سینکڑوں ہزاروں محدثین نے اپنی عمریں اسی کام میں صرف کر دیں، ایک ایک شہر میں گئے، راویوں سے ملے، ان کے متعلق ہر قسم کی معلومات بہم پہنچائے، جو لوگ ان کے زمانے میں موجود نہ تھے، ان کے دیکھنے والوں سے حالات دریافت کیے، ان تحقیقات اسماء الرجال (بائیوگرافی) کا وہ عظیم الشان فن تیار ہو گیا، جس کی بدولت آج کم از کم لاکھ اشخاص کے حالات معلوم ہو سکتے ہیں اور اگر ڈاکٹر اسپرنگر کے حسن ظن کا اعتبار کیا جائے تو یہ تعداد پانچ لاکھ تک پہنچتی ہے۔“

واضح رہے کہ ہم نے اپنے مضمون میں اس نکتے پر اپنی بحث مرکوز کی تھی کہ: ”امام طبریؒ نے ایک ایسا دور پایا تھا،

جب کہ آئندہ نسلوں کے لیے حدیث و روایات کے ورثے کی من و عن، بلا کم و کاست منتقلی پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ آپ کے دور کے آتے آتے صحابہ تابعین اور تبع تابعین کا دور ختم ہو رہا تھا اور ڈر تھا کہ کہیں اس طبقے کے افراد کی آنکھیں بند ہوتی ہی، علم و روایت کے انمول ذخیرے بھی قبروں کی مٹی میں گھل نہ جائیں، تو ان کی روایات اور آثار کی حفاظت پر توجہ زیادہ دی جانے لگی۔ لہذا آپ کے زمانے میں اہل علم کا روایات جمع کرنے کا جو طریقہ رائج تھا، امانت داری کے ساتھ آپ نے اسے اپنایا ہے اور روایت نقل کرتے وقت آپ کی حیثیت عدالت کے ایک جج کی نہیں بلکہ عدالتی پراسیکیوٹر کی ہے جو اپنے ہاتھ میں ملنے والے تمام دلیلوں اور شواہد کو سینت سینت کر محفوظ رکھتا ہے، اور فیصلہ فاضل عدالت پر چھوڑ دیتا ہے۔ ہمیں محترم اور با صاحب کے اس بیان سے خوشی ہوئی کہ ”وہ عربی زبان سے واقف ہیں۔“ لیکن انہوں نے اپنے کالم میں یہ نہیں بتایا کہ تاریخ طبری کے عربی ایڈیشن میں یہ جو مصنف کا فرمان ہے کہ ﴿اذ لم نقصد بکتاننا هذا الاحتجاج بذلک (تاریخ الطبری، اول، ص ۷)﴾ کہ ہمارا ارادہ اس کتاب کے لکھنے سے یہ نہیں ہے کہ لوگ اس سے سند پکڑیں اور حجت لیں، یا یہ کہ ﴿والانصار النسی انا مسندھا المی روا تھا﴾ ان آثار کو ہم نے ان کے راویوں تک سند کے ساتھ بیان کر دیا ہے کہ آپ نے اپنے دور کی روایتوں کے نقل کرنے کے لئے رائج اصول کو امانت دار اور غیر جانب داری سے اپنایا ہے یا نہیں؟

محترم کالم نگار کا یہ فرمان ہے کہ: ”میری حیرت کی اس وقت انتہا نہ رہی جب میرے سیکولر دوست تو میری اس وضاحت پر خاموش ہو گئے، لیکن چند علمائے امت اپنی تلواریں سونت کر مجھ پر پل پڑے..... ان علماء نے طبری کا دفاع صرف اس لئے کیا کہ گزشتہ چند سو سالوں سے ان کے مدارس میں تفسیر جلالین پڑھائی جاتی ہے اور اس میں اس واقعہ غرانیق کا ذکر ہے جس کا ماخذ طبری کے سوا کوئی اور نہیں۔“

ہماری نظر سے ابھی تک کالم نگار کے فرمان کے جائزے پر مبنی پاکستان کے اخبارات و رسائل میں کوئی مضمون نہیں گزرا ہے۔ شاید فاصلوں کی وجہ سے ایسا ہوا ہو۔ رہی بات ”حضرت زید کے کناح کی روایت کی یا غرانیق کی“ تو کوئی مسلمان اہل علم ایسا نہیں جو انہیں درست سمجھتا ہو، لیکن یہ سمجھنا کہ امام طبری نے انہیں درست مان کر نقل کیا ہے، امام صاحب کے ساتھ سراسر سنگین زیادتی ہے۔ کالم نگار کا یہ کہنا کہ ان کا ماخذ طبری کے سوا کوئی اور نہیں ہے، موصوف کی لاعلمی کی ایک اور دلیل ہے۔ یہ موضوعات سیرت و تاریخ کے گھسے پٹے موضوعات ہیں، ان پر عرصہ دراز قبل تحقیقی کام ہو چکا ہے۔ ایک نظر شیخ محمد ناصر الدین الالبانی کے رسالہ نسف المسجانیق لسنف قصة الغرانیق پر ڈال لیں۔ اس سے پتہ چل جائے گا کہ یہ روایت طبری کے علاوہ کن کن راستوں سے در آئی ہے۔ یہ امام طبری اور دوسرے ائمہ روایت کا احسان ہے کہ انہوں نے غلط اسانید کو من و عن پیش کر دیا جس کی وجہ سے جن راستوں سے غلط روایات داخل ہوئیں ان کا علم ہو پایا۔ اگر یہ ائمہ محمد بن سائب کلبی، سیف بن عمر تمیمی، اور ابوحنیفہ لوط بن یحییٰ وغیرہ کی روایات کو اسانید کے ذکر کے ساتھ نہ لاتے تو ان کے غیر ثقہ یا ضعیف راویوں کی کڑیاں کبھی نٹل پاتیں۔ ان ائمہ نے اسانید کے

ساتھ روایات کو نقل کر کے مرض کی جڑ تک پہنچنا آسان کر دیا ہے، اب اس پر ان کی خدمت کا اعتراف کرنے کے بجائے انھی پر گرز چلانے والوں کو دیکھ کر کبیر داس کا دوہا یاد آتا ہے کہ

رنگی کو نارنگی کہیں بنے دودھ کو کھویا چلتی کو یہ گاڑی کہیں دیکھ کبیر ارویا

علم رجال بہت سے عالم فاضلوں کے لئے بھی بڑا خشک موضوع ہے۔ اس کی فنی باریکیوں کو سہل زبان میں اس طرح پیش کرنا کہ متوسط سطح کا قاری آسانی سے سمجھ سکے، بہت مشکل کام ہے۔ یہ اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ جھوٹا بھی سچ بولتا ہے، اور اگر وہ عینی گواہ ہو تو اس سے کسی واقعے کے بارے میں ایسی باریکیاں اور تفصیلات ملتی ہیں جو حقیقت تک پہنچنے میں مدد معاون ثابت ہوتی ہیں۔ لہذا علمائے حدیث نے ضعیف اور غیر ثقہ راویوں کو جھوٹ کا پلندہ سمجھ کر چھوڑ نہیں دیا ہے بلکہ ان کی تحقیق اور ان روایات کا ثقہ روایات سے موازنہ کر کے ضعیف راویوں کی روایات میں اضافوں اور ان اضافوں کے علمی فوائد کا باریک بینی سے جائزہ لے کر اہم علمی نکات نکالے ہیں۔ اب مرویات ابسی مخنف فی تاریخ الطبری (ضخامت: ۵۲۴) تصنیف یحییٰ بن ابراہیم بن علی یحییٰ کو ہی لیجئے۔ اس میں ابی مخنف کی تاریخ طبری میں روایت کردہ ہملہ روایات کا تجزیہ کیا گیا ہے اور سند میں موجود ایک ایک راوی، روایتوں میں ان کے اضافے اور صحیح روایات سے ان کی مطابقت کا جائزہ لیا گیا۔

کالم نگار صاحب کی اس بات نے کہ: ”میرے سیکولر دوست تو میری اس وضاحت پر خاموش ہو گئے“ ہمیں حیرت میں ڈال دیا ہے۔ سیکولر طبقہ میں سے کوئی دینی روایت کے ورثے کی اہمیت کم کرنے کی کوشش کرتا تو کون ان کی باتوں پر دھیان دیتا، جب کہ اور یا صاحب کا شمار تو خورگرم اصحاب میں ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے ایک ہمدرد کی حیثیت سے ان کے سطحی اور تباہ کن بیان کو درست سمجھنے والے لٹلے مصنفین بھی موجود ہیں۔ سیکولر طبقہ کے ایسے بھاگ کہاں، ان کی دشمنی تو کھلی ہوئی ہے، لیکن بیٹھے زہر کا تریاق کہاں سے لائیں۔ آخر حرف شکایت وہ زبان پر کیوں لاتے، ان کے دل کی بات تو کالم نگار کی زبان سے ادا ہو گئی ہے۔

یہ بات دینی و عربی کتابوں کا ادنیٰ قاری بھی جانتا ہے کہ تفسیر الطبری (جامع البیان عن تاویل آی القرآن) اور تاریخ الطبری (تاریخ الامم و الملوک) اہل سنت کے امام ابو جعفر محمد بن جریر طبریؒ ف ۳۱۰ھ کی تصنیف ہے۔ اگر کالم نگار کو اس میں بھی شک تھا تو پھر اس نے امام طبریؒ پر کالم سیاہ کر کے خود پر بڑا ظلم کیا ہے۔ جس کے سر ہانے مستشرقین کی کتابیں پڑی رہتی ہیں، اسے کم از کم کارل بروکلمان کی کتاب: *Geschichte der Arabischen Literatur* ہی کی جانکاری حاصل کر لینی چاہئے تھی۔ اس عظیم مستشرق نے اپنی کتاب میں عہد جاہلیت سے ۱۹۳۹ء تک جتنی کتابیں عربی زبان میں لکھی گئی ہیں، ان کے مصنفین کون کون ہیں؟ ان کتابوں کی مصنفین کی طرف نسبت کن کن علمی حوالہ جات سے ثابت ہے؟ ان کے قلمی نسخے دنیا کے کن کن کتب خانوں میں موجود ہیں؟ یہ کب اور کہاں کہاں چھپی ہیں؟ ان کے حالات زندگی پر کون کون سی کتابوں اور مقالات میں تذکرہ ملتا ہے؟ ان

سب باتوں کا اشارہ دیا ہے۔ یا پھر ڈاکٹر فواد سزگین کی Geschichte des Arabischen Schrifttums دیکھ لیتے جس میں سزگین نے ۴۳۰ھ تک کے مصنفین کے تعلق سے بروکلیمان کے پروجیکٹ کو آگے بڑھایا ہے، اور جس پر انہیں لٹریچر کا پہلا ”شاہ فیصل ایوارڈ“ ملا تھا۔ ان دونوں کتابوں کے جس حصے کا عربی ترجمہ تاریخ الادب العربی اور تاریخ التراث العربی کے عنوان سے ہوا ہے، اس میں طبری سے متعلق تفصیلات موجود ہیں۔ حکمت بشیر یسین کا سزگین کی کتاب کا مکملہ استدار کسات علی الساریخ التراث العربی بھی آٹھ جلدوں میں دستیاب ہے۔ اب کتابوں کے مصنفین کے بارے میں ان جیسی کتابوں ہی میں تو قابل اعتبار معلومات ملیں گی، یہ تو نہیں ہو سکتا کے پنساری کی دکان پر جلوہ جلیبی ملا کرے۔

تحدیثِ نعت کے طور پر یہ کہنے میں مضائقہ نہیں کہ عالمی قلمی کتابوں کی ایک لائبریری میں ہم کو دس سال تک مخطوطات کے تعارفی کارڈ تیار کرنے کی ذمہ داری نبھانے کا موقع ملا ہے۔ ان کارڈوں کی تیاری میں بنیادی کام کتاب کی ابتدائی و اختتامی عبارت اور کتاب کی داخلی شہادتوں کی مطابقت کے ساتھ ساتھ مختلف مراجع، کمالہ کی معجم المؤلفین، زرکلی کی الاعلام، حاجی خلیفہ کی کشف الظنون، اسماعیل باشا بابانی کی ایضاح المکنون اور ہدایۃ العارفین، آقا بزرگ طہرانی کی الذریعہ الی تصانیف الشیعہ۔ الفہرس الشامل للتراث العربی المخطوط جیسی انسائیکلو پیڈیا کی ٹائپ کی کتابوں اور عالمی کتب خانوں کے کیٹلاگوں سے مراجعت کی ضرورت پیش آتی تھی۔ کوئی دن نہیں جاتا جب بروکلیمان اور سزگین کی جرمنی زبان میں ترتیب دی گئی موسوعاتی کتابوں کی ورق گردانی کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اس تجربے کی بنیاد پر یہ کہنے میں ہمیں کوئی مضائقہ محسوس نہیں ہوتا کہ کالم نگار نے بیان کر کے کہ: ”کہیں بھی معلوم نہیں پڑتا کہ تصدیق کی جائے کہ کون سی کتب کس طبری کی لکھی ہوئی، بڑے بھونڈے پن کا مظاہرہ کیا ہے۔“

اور یا صاحب کی تحریریں ہم بڑی قدر و منزلت کے جذبے کے ساتھ پڑھتے آئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ہزاروں لوگوں تک پہنچانے کی سعادت بھی حاصل کرتے رہے ہیں۔ چند سال قبل جب آپ دوہی تشریف لائے تھے اور آپ کے لکچر میں شرکت کا ہمیں موقع نہ مل سکا تھا تو بڑا رنج اور افسوس ہوا تھا۔ امام طبری کے حوالے سے ان تین کالموں کے بعد بھی آپ کے کالموں میں ہماری دلچسپی جون کی توں برقرار ہے۔ خدا را آپ پر اعتماد کو مجروح کرنے کے اسباب پیدا نہ کیجئے۔ علم و تحقیق پر اعتماد اور بھروسہ بڑے جتن کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ اسے پیدا کرنے کے لئے عرصہ تک پتہ چلانا پڑتا ہے، لیکن اسے گنوانے کے لئے زیادہ محنت کرنی نہیں پڑتی۔ معمولی سی ہٹ سالہا سال کی محنت پر پانی پھیر دیتی ہے۔ آپ جیسے اہل قلم جنہوں نے اسلام اور مسلمانوں کے دفاع میں رت چگا کیا ہے۔ ان پر سے اعتماد اٹھ جانا امت کے لئے بڑے خسارے کا باعث ہوگا۔ خدا را ایسا رویہ تو اختیار نہ کریں کہ ایک بار نہیں بلکہ بار بار کہنا پڑے کہ ”خوگرہم سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے“۔

ہم نے اپنے وضاحتی مضمون کا اختتام ابن جریر طبری سے وابستہ کتابیات پر کیا تھا، تا کہ پتہ چلے کہ ابن جریر طبری کی جلالہ شان کے مطابق ان کی کتابوں پر تحقیقی کام ہو چکا ہے، لہذا اب مزید کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے، الایہ کہ کوئی نیا نکتہ محققین کے سامنے آجائے۔ اسکے باوجود کالم نگار یہ کہہ کر قاری کو حیرت و تعجب میں ڈال دیتے ہیں کہ: ”طبری کی تفسیر کے رجال کا کام تو مصر کے محمود شاہ نے کیا ہے، لیکن آج تک تاریخ طبری کے رجال اور راویوں پر مفصل کام نہیں کیا“۔ تو قدر مکرر کے طور پر ہمارے گزشتہ کالم کا یہ پیرا گراف دوبارہ پڑھنے میں حرج نہیں کہ:

”امام طبری کی کتابوں کی تحقیق اور اس کی اسانید کی صحت پر علمی دنیا میں کافی تحقیقی کام ہوا ہے۔ ان میں سے جو کتابیں ہمارے آرکائیوز میں محفوظ ہیں، ان میں سے چند کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے:

۱۔ تحقیق مواقف الصحابه فی الفتنة من روايات الامام الطبری و المحدثین، تصنیف: ڈاکٹر امجدون، صفحات: ۶۹۴/ اس کتاب میں صحابہ کے مابین دور فتنہ سے متعلق امام طبری کی جملہ روایات کا دیگر محدثین کی نقل کردہ روایات سے موازنہ کر کے ایک ایک راوی اور واقعہ سے بحث کی گئی ہے۔

۲۔ مرویات ابی مخنف فی تاریخ الطبری، تصنیف: یحییٰ بن ابراہیم بن علی الجلی، صفحات: ۲۵۸/ اس میں طبری کے اہم ضعیف راوی ابی مخنف کی ایک ایک روایت کی تحقیق کی گئی ہے۔

۳۔ رجال تفسیر الطبری جرحاً و تعدیلاً، تصنیف: محمد بن حسن الحلاق، صفحات: ۶۰۸/ اس میں تفسیر طبری میں جن راویوں سے روایتیں لی گئی ہیں، ان کے بارے میں فردا فردا تحقیق کی گئی ہے۔ اور اس سلسلے میں دو عظیم علماء شیخ احمد شاہ اور محمود شاہ کی رائے بیان کی گئی ہے۔

۴۔ صحیح تاریخ الطبری و ضعیف تاریخ الطبری، تصنیف: محمد طاہر البرزنجیا شراف، محمد صبحی حسن حلاق، ۱۳ جلدوں میں مطبوعہ اس کتاب میں طبری کی ایک ایک روایت کے بارے میں صحیح یا ضعیف ہونے کے تعلق سے تفصیلات فراہم کی گئی ہیں۔“

اس سلسلے میں مزید عرض کرنا یہ ہے کہ محمود محمد شاہ کی بنیادی طور پر ایک ادیب اور زبان دان تھے، ان کے بھائی شیخ احمد محمد شاہ کا آخری دور کے عظیم محدثین میں شمار ہوتا ہے۔ محمود محمد شاہ نے بیس پاروں کی تفسیر کی تحقیق مکمل کی ہے، لیکن اس میں ان کی توجہ زیادہ تر مختلف قلمی نسخوں کا موازنہ کرنے اور متن کی درستی پر صرف ہوئی۔ تفسیر طبری کی تخریج کا اہم اور وسیع کام اس کے چند سال بعد سامنے آیا ہے اور وہ ہے ڈاکٹر عبداللہ عبدالرحمن التزکی سکرٹیٹری جنرل رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے زیر نگرانی تحقیق شدہ تفسیر الطبری: جامع البیان عن تاویل آی القرآن لابی جعفر محمد بن جریر الطبری، ف ۳۱۰ھ کا نسخہ جسے مرکز الجوث والدراسات العربیة والاسلامیة بدارنجر نے ۲۶ جلدوں میں شائع کیا ہے، اور اس کی ہر جلد تقریباً ۸۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ہر ایک روایت اور راوی کے بارے میں چھان پھنگ کی گئی ہے۔ اس ایڈیشن میں میں محمود شاہ کی تحقیقات کو بھی ضم کیا گیا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ ہمارے محترم بھائی اور یا مقبول صاحب نے ڈاکٹر خالد طلال کبیر کی کسی تحریر کے رد عمل میں طبریٰ پر یہ کالم لکھے ہیں۔ ہم نے بہت کوشش کی کہ ان صاحب اور ان کی کتاب یا تحقیق کا پتہ لگائیں، لیکن ہمیں ہنوز اس سلسلے میں معلومات دستیاب نہیں ہو پارہی ہیں۔ اگر کوئی قاری اس سلسلے میں معلومات فراہم کر سکیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ ویسے کالم نگار نے ڈاکٹر خالد سے حاصل شدہ جو معلومات دی ہیں، ان میں ہمارے لیے کچھ بھی نیا نہیں ہے۔

یہ بتانے میں شاید مضائقہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے گذشتہ چھتیس سال سے ہماری روزی روٹی کا انتظام کتابیں پڑھنے میں کر رکھا ہے۔ ممکن ہے قارئین ہماری رائے سے اختلاف کریں، لیکن ہمارا ذاتی مشاہدہ یہ ہے کہ ۱۹۷۰ء کے عشرے کے ختم ہوتے ہوتے گذشتہ ایک صدی تک اردو زبان میں لکھی جانے والی تاریخی و فکری تحقیقات کو عربی سمیت دیگر زبانوں کے لٹریچر پر فوقیت حاصل رہی۔ لیکن گذشتہ صدی میں اسی کے عشرے کے شروع ہوتے ہوتے ان عبرتی شخصیات کا دور برصغیر سے ختم ہونے لگا۔ اسی دوران میں سنہ ساٹھ کے عشرے میں قائم ہونے والی مدینہ یونیورسٹی، امام محمد بن سعود یونیورسٹی، اور ام القری یونیورسٹی کے فارغین کے علمی کارناموں کا دور شروع ہوا، سعودیہ کی ان یونیورسٹیوں میں عالم اسلام سے چندہ دماغ بلائے گئے تھے جنہوں نے علم و تحقیق کا نیا ولولہ اور ذوق دیا۔ ان شخصیات میں شیخ محمد ناصر الدین الالبانی، شیخ حماد الانصاری، شیخ عبدالرحمن المعلمی، شیخ عبدالفتاح ابو غدة جیسی عظیم شخصیات شامل تھیں، جنہوں نے علم الرجال میں ایک نئی روح پھونک دی۔ پھر اس کام کے بیڑے کو مدینہ یونیورسٹی کے عراقی محقق ڈاکٹر اکرم ضیاء العری نے آگے بڑھایا، جنہوں نے خود صحیح السیرۃ النبویۃ اور عصر الخلفاء الراشدہ: محاولة لنقد الروایة التاریخیة جیسی معرکہ آرا کتابیں نہ صرف تصنیف کیں، بلکہ جن موضوعات پر اب تک تحقیقات نہ ہونے کا محترم اور یا صاحب کر رہے، تقریباً ان سبھی موضوعات پر یونیورسٹیوں کے ہونہار طلبہ سے سالہا سال محنت شاقہ لے کر ڈاکٹریٹ اور ایم فل کے مقالات تیار کروائے۔ اپنے وقت میں علامہ شبلی کی سیرت النبی کا مقدمہ علم تاریخ میں ایک تجدیدی کارنامہ شمار ہوتا تھا، لیکن بروقت اس کا عربی میں ترجمہ نہ ہونے کی وجہ سے بیسویں صدی کے اواخر میں منظر عام پر آنے والی علمی و تاریخی تحقیقات اس مقدمہ کو پیچھے چھوڑ گئیں۔

کالم نگار نے آخر میں مسعود احمد بن ابیسی کے لیے دعا کی ہے اور ان کی کتاب صحیح تاریخ الاسلام و المسلمین کو قرآن اور حدیث کی روایتوں پر مبنی قرار دیا ہے۔ ہم بھی آپ کی دعاؤں میں شریک ہیں، لیکن ہمیں معلوم نہیں کہ مرحوم کو علم حدیث اور علم تاریخ میں کہاں تک درک حاصل تھا اور کہاں تک علمی تحقیقی اصولوں سے تجاوز کرتے ہوئے اپنے میلان کو ترجیح دی ہے۔ ۱۹۸۰ء کے اوائل میں مسعود صاحب کے چند رسائل ہمارے مطالعے سے گزرے تھے۔ سنا ہے کہ مرحوم انہیں کراچی کے گلی کوچوں میں سائیکل پر لاد کر بانٹا کرتے تھے۔ ان رسائل کے ہاتھ آنے سے بہت پہلے ہم نے بھی تصوف پر مبنی لٹریچر، خواجہ معین الدین اجمیری، خواجہ مختار کعلکی، شرف الدین یحییٰ منیری، خواجہ فرید الدین شکر گنج اور خواجہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات اور مجدد الف ثانی کے مکتوبات، اور شیخ عبد

الوہاب شعرائی کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا تھا۔ ان میں سے بہت سی باتیں ہمیں بھی عجیب سی لگتیں تھیں۔ پھر مسعود احمد صاحب کے رسائل ہاتھ لگے جن میں ان بزرگان دین کے ملفوظات کے اقتباسات کے عکس اور ان پر شدید نقد ہوتا تھا۔ ناممکن تھا کہ انہیں پڑھنے کے بعد برصغیر میں امت مسلمہ کے ان محسنوں پر اعتقاد و اعتماد باقی رہے۔ کچھ عرصہ بعد ہمیں حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی وہ تقریر ملی جس کی عبارت سے آج اس مضمون کا آغاز کیا گیا ہے۔ پھر ہم نے محسوس کیا کہ ہمارا معاشرہ شخصیت پرستی سے تعبیر ہے۔ اگر محترم شخصیات کی خامیاں، مبالغہ آمیز جنگلی لہجے میں ابھارنے میں قوم کے دانشور لگ جائیں گے، تو پھر یہ قوم یا تو مکمل طور پر اسلام کی ان تاریخی علامتوں سے باغی ہو جائے گی، یا پھر عقیدت میں غلو کی وجہ سے اپنی خامیوں میں مزید پختہ ہو جائے گی، اور یہ دونوں راہیں امت کی فلاح پر ختم نہیں ہوتیں۔ معلوم نہیں کہ کالم نگار نے مسعود احمد کی کتاب کی تعریف اسے پڑھ کر کی ہے یا پھر مصنف کا دعویٰ دیکھ کر۔ کالم نگار ہماری رہنمائی کریں کہ طبری کے بارے میں صحیح تاریخ الاسلام و المسلمین کی یہ عبارت پڑھنے کے بعد ان کے مدد و ح کی یہ کتاب کے مزید اوراق کھولیں یا اسے بند کر دیں کہ: ”علامہ طبری نے بہت سی کتابیں تصنیف و تالیف کیں، ان کی تمام کتابیں ہم تک نہیں پہنچیں، البتہ ان کی ایک تفسیر اور ایک تاریخ ہم تک پہنچی ہے۔ محمد بن جریر محدث تھے، لہذا انہوں نے تاریخ میں بھی محدثین کا طریقہ استعمال کیا، یعنی تاریخ کی تدوین میں انہوں نے اسناد کا خاص خیال رکھا۔۔۔ ان پر شیعیت کا بہتان بے بنیاد ہے۔ وہ شیعہ ہرگز نہیں تھے۔“

امیر عبدالقادر الجزائریؒ

تصنیف: جان ڈبلیو کاتزر O بیسی لفظ: مولانا زاہد الراشدی

الجزائر کے عظیم مجاہد آزادی کی داستان حیات

”عظیم آدمی اتنی فراوانی سے نہیں ملتے کہ ہم ان کے لیے دو بول کہے بغیر انہیں گنوادیں۔۔۔۔۔ ایک پاک محبت وطن، ایک ایسا سپاہی جس کی فطانت اور حاضر دماغی شک و شبہ سے بالاتر ہو، جس کا وقار بے داغ ہو، ایک ایسا ریاست کار جو افریقہ کے جنگلی قبائل کو متحد کر کے بے مثال مد مقابل بنا سکے، ایک ایسا ہیرو جو حرف شکایت زبان پر لائے بغیر شکست اور تباہی کو تسلیم کر لے، اگر یہی وہ خوبیاں ہیں جو ایک آدمی کو عظیم بناتی ہیں تو پھر عبدالقادر اس صدی کے چند گنے چنے عظیم آدمیوں کی سب سے اگلی صف میں کھڑا ہونے کا حق دار ہے۔“ (نیویارک ٹائمز، فروری ۱۸۸۳ء)

[صفحات: ۲۵۶ - قیمت: ۲۵۰ روپے]

ناشر: دارالکتاب، اردو بازار، لاہور

مکاتیب

۲۷ ذی الحجہ ۱۴۳۶ھ ۷ اکتوبر ۲۰۱۵ء

بخدمت محترم و مکرم مولانا زاہد الراشدی زید لطفہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ کے رسالہ ”غامدی صاحب کا تصور حدیث و سنت“ کا اشتہار الشریعہ میں نظر پڑا تو میری خواہش پر اس کی ایک کاپی میاں عمار صاحب نے مجھے بھیج دی ہے۔ میں شکر گزار ہوں کہ مستفید ہونے کا موقع ملا۔ اللہ آپ کے افادات کو قائم و دائم رکھے۔ مگر استفادہ کیلئے شکرگزاری کے ساتھ ایک شکوہ گزار کی بھی اجازت ہو۔ آپ کی تحریر بتا رہی ہے کہ آپ غامدی صاحب کے موقف کو بالکل غلط سمجھ رہے ہیں یہاں تک کہ ”وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ اَوْ رَوَّيْتِغِ سَبِيْلَ غَيْرِ الْمَوْ مِيْنِيْنَ كِي حِدُوْل كُوْجْهَوْنَا هُوَا۔ مگر ان کے لئے آپ کے احترام اور برادرانہ موڈت پر اس کا ادنیٰ اثر نہیں دیکھنے میں آتا۔ جو آدمی وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ كِي حِدُوْل كُوْجْهَوْر هَا هِيْ اَسْ كِي لِيْ جْهِيْ بَرَادِرَانِهْ مودت و احترام کی گنجائش!

یہ آپ کی جون ۲۰۰۸ کی تحریر ہوئی۔ اس پر محترم غامدی صاحب کے شاگرد آپ کو جواب دیتے ہیں جس پر آپ خود محترم ہی کی طرف سے وضاحت کے لئے ”درخواست“ گزار ہوتے ہیں۔ محترم آپ کی ”گزارش“ کو قبول کرتے ہوئے اپنے ماہنامہ ”اشراق“ مارچ ۲۰۰۹ء میں وضاحت فرماتے ہیں۔ اور اپنے اور علماء کے اختلاف کو محض اصطلاحات کا فرق بتاتے ہوئے فرماتے ہیں:

”میرے ناقدین اگر میری کتاب ”میزان“ کا مطالعہ دقت نظر کے ساتھ کرتے تو اس چیز کو سمجھ لیتے۔ اور انھیں کوئی غلط فہمی نہ ہوتی۔ یہ توقع اب بھی نہیں۔ دین کے سنجیدہ طالب علم البتہ مستحق ہیں کہ اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کے لئے چند معروضات ان کی خدمت میں پیش کر دی جائیں۔“

اس ارشاد کے مطابق ہمارے محترم مولانا زاہد الراشدی اپنے محترم جناب غامدی کی نگاہ میں ”دین کے (ایک) سنجیدہ طالب علم“ سے زیادہ کے خانے میں نہیں آتے۔ مگر ہمارے مولانا کا ظرف کہ آگے گفتگو غامدی صاحب کے لئے اس احترام سے بہر حال محروم نہیں ہوئی ہے جو چلا آ رہا تھا۔ یہاں مجھے اپنے تایا صاحب کا ایک لطیفہ یاد آ رہا ہے۔

طبیعت میں لطافت تھی اور شرک و بدعت کے بارے میں بالکل مولانا اسماعیل شہید کا ذہن رکھتے تھے۔ دوسری طرف محلہ میں شرک و بدعت کی دکانیں بھی چل رہی تھیں۔ اپنا مکان ایسی جگہ واقع تھا کہ سارے محلہ کی گزرگاہ۔ تاجا صاحب ایسے لوگوں کو نظر میں رکھتے تھے جن کی ان دکانوں میں آمد و رفت ہوتی اور کسی کو مناسب سمجھتے تو حال چال پوچھنے کو بلا لیا کرتے۔ ایک صاحب سے ان کے مولانا صاحب کا حال پوچھا جو بیمار چل رہے تھے۔ بیچارے سیدھے سے تھے۔ بولے کہ بڑے مولیٰ صاب نے جب سے مسجد کی زمین بیچ لی، تب سے نہیں چار پائی سے اٹھ پائے۔ تاجا صاحب نے لطف لیا اور فرمایا: مگر رہے پھر بھی بڑے مولیٰ صاب ہی!

خیر یہ تو لطف تھا کہ ذرا دیر کو فضا بدل جائے۔ عرض یہ کرنا تھا کہ غامدی صاحب کے کلام میں جو اذعائیت ہے یعنی یہ طرز کلام کہ

”ہمارے علماء ان تینوں کے لئے ایک ہی لفظ ”سنت“ استعمال کرتے ہیں۔ میں اسے موزوں نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک پہلی چیز کے لئے ”سنت“ دوسری کے لئے ”تفہیم و تمہین“ اور تیسری کے لئے ”اسوۂ حسنہ“ کی اصطلاح استعمال ہونی چاہئے۔“

تو ”ہمارے علماء“ کے مقابلہ میں یہ ”میں ان کی اصطلاح کو موزوں نہیں سمجھتا۔“ اور میرے نزدیک یہ ہونا چاہئے، وہ ہونا چاہئے۔“ کیا اس ہفت آسمانی طرز کلام والے ”کئے آمدی و کئے پیر شدی“ لوگوں کے ساتھ یہ ”سراپا احترام طرز گفتگو دینی نقطہ نظر سے مناسب ہے؟ ان کی اذعائیت ان کے بطلان کی طرف سے اطمینان کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اور صاحب مقام علماء کی طرف سے یہ سراپا احترام طرز گفتگو اس پر پردہ ڈالنے والا ہے۔ مجھے یہ عرض کرنے میں معاف رکھے کہ محترم کے سلسلہ میں الشریعہ کے رئیس التحریر کی یہ حد سے بڑھی کر ایمانہ روش ایک مدعی کو قابل لحاظ بننے میں مددگار ہوئی ہے۔ نہ کیجئے حافظ صلاح الدین یوسف صاحب کے لہجہ میں گفتگو مگر اس کا بالکل عکس، یہ تو آپ کے منصب نہیں کہی جا سکتی۔ والسلام

گستاخی کے لئے عفو خواہ،
عتیق الرحمن سنبھلی

(۲)

1989ء میں قائد اعظم یونیورسٹی میں الیکٹرانکس میں داخلہ ہوا تو شروع شروع کے دنوں میں جن کلاس فیلوز سے قریبی تعلق ہو گیا ان میں کراچی کا ایک دوست (نام حنیف فرض کر لیجیے) بہت محنتی اور ملنسار تھا اور پڑھائی اور اسائنمنٹس مکمل کرنے میں بہت ساتھ دینے والا۔ ہم لوگ رات گئے تک پڑھتے۔ ہم کلاس فیلوز سارے پاکستان سے دور دور سے آئے تھے اور ہمارے کچھ کلاس فیلو اردن، شام، فلسطین، سعودیہ، مصر وغیرہ کے بھی تھے۔

حنیف کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ ہر ایک کے کام آنے کی کوشش کرتا۔ کبھی اس کے کمرے میں گئے تو معلوم ہوا کہ فلاں دوست کے ساتھ ڈپنٹری گیا ہوا ہے یا فلاں کی دوائی لینے کے لیے آ پوارہ مار کیٹ گیا ہوا ہے۔ کوئی گھر سے آ رہا ہے

اور اس کا سامان زیادہ ہے تو اسے لینے ٹیشن گیا ہوا ہے (اس دور میں ریل سے سفر ہوتا تھا)۔ ایک مرتبہ ایک اردنی کلاس فیلو کو لے کر سفارت خانے جاتا پایا گیا۔ ایک دن میں لیٹ ہو رہا تھا تو مجھے کہنے لگا کہ مولوی تو ہاتھ روم میں گھس، میں تیرے کپڑے استری کر کے تجھے وہیں پکڑا دیتا ہوں۔ رات کو کنٹینن بند ہو جاتی تو اس وقت جاگ کر پڑھنے والے الوؤں کے لیے اس کے کمرے میں کچھ نہ کچھ کھلا بھجوا دیا جاتا۔ ان الوؤں کو نائٹ رائیڈرز کہا جاتا تھا جو ان دنوں ٹی وی پر چلنے والی ایک امریکی سیریل RiderKnight کی نقل صوتی تھی۔

ابھی دو ماہ بھی نہ گزرے تھے اور ہم لوگوں کو ابھی تک ہوم سکنیس بھی ہوا کرتی تھی کہ حنیف نے سارا اسلام آباد اور اس کے بیشتر دفاتر چھان مارے اور ہر جگہ اس کا تعلق بن گیا۔

ایک دن یہ انکشاف ہوا کہ حنیف مرزائی ہے۔ سب لوگوں کی نظریں بدل گئیں۔

یہ انکشاف میرے لیے بھی بہت صدمے کا باعث تھا۔ اب میں دورا ہے پر تھا۔ مجھے یہ فیصلہ کرنے میں ایک آدھ منٹ لگا کہ میں حنیف کو خود سے کاٹ دوں یا اسے ساتھ لیے رکھوں۔ میں نے دوسرے والا فیصلہ کر لیا تھا۔

اس رات بھی ہم پڑھنے کے لیے بیٹھے۔ اپریل کا آغاز تھا اور موسم ابھی خاصا خنک تھا۔ میں نے حنیف کو یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ مجھ تک یہ خبر پہنچ چکی ہے۔ رات بھر بیٹھے پڑھتے رہے۔ میں کوشش کرتا تھا کہ اگر پڑھتے پڑھتے رات کے تین بج جائیں تو فجر خراب نہ کروں بلکہ کسی طرح فجر کا وقت داخل ہوتے ہی نماز پڑھ کر پھر سوؤں۔ اس رات بھی فجر کی اذان ہونے تک جاگے۔ میں نے بڑے بھولپن سے اسے کہا کہ یا آج مسجد میں چل کر نماز پڑھتے ہیں۔ اس نے تہقہ لگاتے ہوئے کہا کہ مولوی تو مجھے مروائے گا۔ میں نے کہا کہ میں ساتھ ہوں۔ کچھ نہیں ہوگا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ مجھے کیمپس میں چلنے والی اس خبر کا کچھ پتہ نہیں ہے۔

ہم فجر کے لیے گئے۔ نماز ختم ہوتے ہی کئی لوگوں نے اسے کچا کھا جانے والی نظروں سے گھور گھور کر دیکھنا شروع کر دیا۔ دعا ہوئی اور ہم فوراً مسجد سے نکلے۔ قاری عطاء۔ الرحمن صاحب کو اللہ خوش رکھے، وہ جلدی سے میری طرف کو بڑھے۔ میں نے انھیں عرض کیا کہ میں رات بھر نہیں سویا ہوں اس لیے دوپہر کو ملیں گے۔ انھوں نے یہ عذر قبول کر لیا۔ کمرے میں پہنچتے ساتھ ہی حنیف نے کہا کہ مولوی تو نے بڑی بے عزتی کرائی ہے میری۔ میں انجان بنا رہا۔ کہنے لگا کہ کل سے میرے بارے میں یہ بات پھیلائی جا رہی ہے کہ میں مرزائی ہوں۔ اور تو بدھو ہے کہ تجھے معلوم ہی نہیں، اور مجھے مسجد میں گھسیٹ لے گیا ہے۔ میں نے تاسف کا اظہار کیا اور سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا آیا۔

یہ دوپہر اور شام بہت اہم (critical) تھی۔ حنیف کا ایک طرح سے سوشل بائیکاٹ ہو گیا تھا۔ لیکن میں معمول کے مطابق اس کے کمرے میں گیا اور اس موضوع پر بالکل کوئی بات نہ کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا رہا۔ چند دن میں حالات معمول پر آ گئے لیکن اس کا فاصلہ بیشتر لوگوں سے بڑھ گیا تھا اگرچہ میرے ساتھ ٹھیک رہا۔

میں کبھی سہ روزے پر جاتا تو وہ مقام تشکیل پر مجھے ملنے ضرور آتا۔ میں نے یونیورسٹی میں پورا باقی عرصہ اس سے کوئی مذہبی بحث نہیں کی بلکہ ان موضوعات کو سختی سے سوچ آف کیے رکھا۔

اس وقت نہ موبائل فون تھا اور نہ ای میل۔ یونیورسٹی سے فراغت ہوئی اور نوکریاں شروع ہوئیں تو ایک دن اس کا فون آیا۔ کہنے لگا کہ میرا سکا لرشپ ہو گیا ہے اور میں چائے جا رہا ہوں، تو مجھ سے ایک بار کہیں مل لے۔ ہم لاہور میں ملے۔ حنیف نے کہا کہ ”میں خاندانی مرزائی ہوں ورنہ میں مرزے پہ..... بھیجتا ہوں۔ میں مسلمانوں کے درمیان رہتا ہوں اور نماز روزہ کرتا ہوں لیکن جہاں میرا خاندانی تعلق سامنے آتا ہے، سب مجھے الگ کر دیتے ہیں۔ میں ان حالات سے سکول کے زمانے سے گزر رہا ہوں۔ یار مولوی، تو گواہ رہنا کہ میں مسلمان ہوں۔ میرا باپ اس وقت فوت ہوا تھا جب میں دس سال کا تھا اور میری مجھ سے چھوٹی چار بہنیں ہیں۔ ہم اس لیے مرزائی ہیں کہ میری اور میری بہنوں کی شادی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک ہم مرزائی نہ ہوں۔ آج میرا ملک سے باہر جانے کا سلسلہ بن گیا ہے۔ اب میں مڑ کے پاکستان کبھی نہیں آؤں گا۔ میں اپنی ماں اور بہنوں کو وہیں بلاؤں گا اور وہیں بہنوں کی شادیاں کروں گا۔ بس تو صرف یہ کرنا کہ ہر چھ مہینے بعد چین آنے والی کسی جماعت کو میرا اور میری یونیورسٹی کا نام لکھ کے دے دیا کرنا۔“ یہ 1994 کی بات ہے۔

میں نے اس کا نام رائے ونڈ کے کچھ متعلقہ لوگوں کو دیا۔ لیکن اس وقت چین جانے والی جماعتیں نہ ہونے کے برابر ہوتی تھیں، اور نہ کوئی چین سے جماعت میں آتا تھا۔ یہ وہ وقت تھا کہ ابھی ڈیڑھ سال کی جماعتیں بھی چلتی تھیں۔ پورے سال میں سوسو اسو جماعتیں، بشکل رائے ونڈ سے نکلتی تھیں۔

اکا دکا جماعتیں بھی حنیف سے ملیں۔ میرا رابطہ پھر نہیں ہوا۔ میں بھی مصروف تر ہوتا چلا گیا اور حنیف بھی زمانے کی گرد میں کھو گیا۔

پچھلے سال رمضان میں حنیف نے مجھے گوگل کر کے اور لنکڈ ان سے دریافت کیا۔ آج وہ ایک بڑے یورپی ملک میں ایک بڑی کمپنی کا کنزرویٹیو مینجر ہے۔ اس نے اپنے بارے میں جو باتیں بتائیں ان کا خلاصہ یہاں لکھتا ہوں:

”میں چائے جانے سے پہلے یہ طے کر چکا تھا کہ مجھے اپنی ماں اور بہنوں کو کسی کافر ملک میں سیٹل کرنا ہے۔ پی ایچ ڈی مکمل کر کے میں پاکستان نہیں آیا بلکہ برطانیہ جاسیٹل ہوا۔ ماں اور بہنیں آگئیں۔ میں نے شادی ایک کورین عیسائی سے کی۔ چاروں بہنوں کی شادیاں چار یورپی ملکوں میں غیر پاکستانی اور غیر ہندوستانیوں سے کیں۔ پاکستان اور سارے اسلامی ممالک میں ہم لوگ آؤٹ کاسٹ تھے، ان ملکوں میں ہم ان ممالک کے شہری ہیں۔ پاکستان میں ہم پانچ مرلے کے مشترکہ گھر میں رہتے تھے اور محلے کے کئی مسلمان دکاندار ہمیں سودا بھی دیتے تھے۔ یہاں آ کر میرے اور میری بہنوں کے اپنے گھر ہیں۔ ہمیں اپنی کچھلی کسی شناخت کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے بچوں اور بھانجے بھانجیوں میں سے کسی کو ہم نے اردو نہیں سکھائی اور وہ اپنے اپنے باپوں کی زبانیں بولتے ہیں۔ اردو نہ سکھانے کا فیصلہ اس لیے کیا کہ ہمیں اس ثقافت سے کچھ واسطہ نہیں رکھنا جہاں ہمیں کافر بنایا گیا ہے۔ اب ہم انٹرنیشنل شہری ہیں اور مختلف عالمی زبانیں بولتے ہیں۔“

میری بیوی ابھی تک عیسائی ہے لیکن اس نے میرے تین بیٹوں کو حافظ بنایا ہے اور ان میں سے دو کو عالم۔ میرے

تینوں بچے ڈیویز بری کے مدرسے سے پڑھے ہیں۔ یہ تینوں بھائی ابھی عملی زندگی میں داخل ہو رہے ہیں۔ ان کی شادیاں بھی میں نان انڈین لڑکیوں سے کروں گا۔ میں اپنے بھانجوں بھانجیوں کی شادیاں بھی نان انڈین سے کروں گا تاکہ پاکستان یا اسلامی ممالک کی کوئی شناخت ہمارے ساتھ نہ لگی رہے۔ ہم کبھی پاکستان نہیں آئیں گے۔

میں کچھ سال بعد تبلیغی اجتماع وغیرہ پر آتا ہوں لیکن کسی کے گھر نہیں جاتا اور نہ کسی کو بتاتا ہوں۔ میں نے ڈاڑھی بھی اس لیے نہیں بڑھائی کہ تشدد نہ لگوں اور نہ میں نے عربی لباس اختیار کیا ہے۔ میں نے چار مہینے بھی اس لیے نہیں لگائے تھے کہ اس کے لیے پاکستان اور ہندوستان آنا پڑتا ہے۔ میں صرف چلہ لگانے پر راضی ہوں تاکہ پاکستان نہ آنا پڑے۔ ہم صرف مرزائی خاندان ہونے کی وجہ سے مرزائی ہیں لیکن ہمیں ہر موقع پر ذلیل کیا گیا ہے۔ ہم نماز روزہ کرنے کے باوجود کافر کہے جاتے تھے۔ ان کفر ملکوں میں رہنے اور پاکستانی شناخت ختم کر لینے کی وجہ سے اب ہم کافر نہیں کہے جاتے۔ پاکستانی شناخت ختم کرنے میں مجھے پورے پچیس سال لگے ہیں اور اگلے پچیس سال اپنی اگلی نسل کی یہ شناخت ختم کرنے میں لگیں گے۔

مولوی! تیرا شکریہ کہ تو نے مجھے پہلے دن سے مسلمان سمجھا۔ میری اور میرے خاندان کی جتنی نیکیاں ہیں وہ تیرے کھاتے میں ہیں۔ اگر اس دن تو مجھے فجر کی نماز پڑھوانے نہ لے جاتا اور مجھ سے قطع تعلق کر لیتا تو میں فیصلہ کر چکا تھا کہ گھر جا کر ماں اور بہنوں کو قتل کر کے خودکشی کر لوں گا۔“

میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے۔ چند سال پہلے جناب محمد اظہار الحق نے یہ مسئلہ چھیڑا تھا کہ کئی لوگ صرف خاندان ہونے کی وجہ سے مرزائی ہیں۔ میں اس وقت خاموش رہا تھا۔ اب بھائی مولوی عمار خان ناصر نے امت کی ان کھوئی ہوئی بھیڑوں کی واپسی کے لیے اپنے عظیم والد مولانا زاہد الراشدی مدظلہ کی نگرانی میں حرکت شروع کی ہے تو میں نے ٹوٹی پھوٹی زبان میں یہ واقعہ لکھنے کا حوصلہ پکڑا ہے۔

ہمارے سخت گیر رویوں کی وجہ سے کتنے ہی لوگ کفر پر جمے ہوئے ہیں اور کتنے ہی مسلمان کفر پر مرے ہیں۔ کاش امت داعیانہ مزاج پر آئے۔ دین اسلام دعوت سے پھیلا ہے، مسلمانوں کی بقا بھی داعیانہ ترتیب پر چلنے میں ہے۔ اللہ سمجھ دے۔

(بعض نام اور ضروری مقامات تبدیل کیے گئے ہیں اور کچھ معلومات میں دانستہ ابہام ڈالا گیا ہے)

حافظ صفوان محمد چوہان

”ذخیرۃ الجنان فی فہم القرآن“

مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی بامقصد کام کرنے والوں کے لیے ایک نادر نمونہ ہے۔ مولانا نے اپنی زندگی قرآن و سنت کی تعلیم کے فروغ کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ قرآن و سنت کی تعلیم ان کا اوڑھنا بچھونا تھی، قرآن و سنت کی تعلیم عام کرنے کے لیے انہوں نے کئی حوالوں سے خدمات سرانجام دیں جن میں مکاتیب قرآنیہ کا قیام، درس و تدریس، وعظ و تبلیغ اور تصنیف و تالیف شامل ہیں۔

مولانا قرآن و سنت کے ماہر عالم اور یگانہ روزگار مدرس تھے۔ انہوں نے نصف صدی سے زائد عرصہ قرآن کریم کا ترجمہ و تفسیر پڑھانے میں صرف کیا۔ وہ صبح نماز فجر کے بعد سے درس قرآن کا سلسلہ شروع کرتے اور نماز عشاء تک وقفوں کے ساتھ یہ سلسلہ قائم رہتا تھا۔ یہ سلسلہ تین مقامات پر تسلسل سے جاری رہا۔ لگھڑ کی جامع مسجد جہاں وہ نماز کی امامت اور خطابت کے فرائض سرانجام دیا کرتے تھے، اس مسجد میں روزانہ نماز فجر کے بعد درس قرآن پنجابی زبان میں ہوتا۔ لگھڑ کی قائم ٹیچرز ٹریننگ کالج میں موسم گرما میں نماز عصر کے بعد اور موسم سرما میں نماز عشاء کے بعد زیر تربیت اساتذہ کو درس قرآن دیتے جو تقریباً عرصہ پچیس سال تک مسلسل جاری رہا۔ جبکہ مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں درس نظامی کے منتہی درجات کے طلبہ کو ترجمہ و تفسیر قرآن پڑھایا کرتے اور دو سال میں پورے قرآن کریم کا ترجمہ مکمل کرتے۔ مدرسہ نصرۃ العلوم میں ہی شعبان و رمضان کی سالانہ تعطیلات میں اساتذہ مدارس اور منتہی درجات کے طلبہ کے لیے دورہ تفسیر کا اہتمام ہوتا جس میں چالیس روز میں پورے قرآن کریم کا ترجمہ و تفسیر مکمل پڑھاتے تھے۔

مولانا کے ان دروس میں سے مدرسہ نصرۃ العلوم کے دروس پر مولانا کے فرزند شیخ الحدیث مولانا عبدالقدوس خان قارن کام کر رہے ہیں جبکہ لگھڑ کی کے درس قرآن مولانا کے شاگرد مولانا محمد نواز بلوچ اور ان کے رفقاء پنجابی سے اردو کے قالب میں ڈھال کر ”ذخیرۃ الجنان فی فہم القرآن“ کے نام سے مرتب کر رہے ہیں اور مولانا کے مرید خاص حاجی میر لقمان اللہ کے زیر اہتمام شائع ہو رہے ہیں۔ مولانا کا درس خالص پنجابی میں ہوتا تھا جس کو اردو میں منتقل کرنا ایک مشکل کام تھا۔ اللہ جزائے خیر عطا فرمائے میر محمد لقمان، مولانا محمد نواز بلوچ اور ان کے رفقاء کو کہ انہوں نے اس علمی

*فاضل مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ۔ لیکچرر گورنمنٹ ڈگری کالج، ہری پور

خزانے کو اردو میں منتقل کر کے عام کر دیا ہے۔ ذخیرۃ الجنان فی فہم القرآن کی پہلی جلد مئی 2002ء میں شائع ہوئی تھی اور اب 21 جلدوں میں یہ سلسلہ پایہ تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔ فالحمد للہ علی ذالک۔

جہاں یہ مجموعہ دروس بہت سے خوبیوں کا حامل ہے، وہیں اس میں بعض اشیاء ایسی بھی آگئی ہیں جو کہ مولانا سرفراز خان صفدر کی بلند علمی نسبت اور معیار کے منافی ہیں۔ دروس و افادات کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کیا جائے اور تقریر سے تحریر کی صورت دی جائے تو مسودے کی ترتیب و تہذیب کے حوالے سے مرتبین پر کافی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ ذیل میں عرض کیے جانے والے ملاحظت کو اسی تناظر میں دیکھا جائے۔

۱۔ کتاب عمدہ جلد بندی کے ساتھ بہت معیاری کاغذ پر شائع ہو رہی ہے، مگر اس میں پروف ریڈنگ کی غلطیاں بڑی تعداد میں پائی جاتی ہیں۔ متن قرآنی کی غلطیاں بہت کم ہیں، مگر پھر بھی بعض جگہوں میں قرآنی الفاظ کے نقل میں سہو کا تب ہو گیا ہے۔ مثلاً جلد اول کے صفحہ 43 پر آیت کریمہ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرَكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (النساء: 145) نقل کی گئی ہے۔ اس میں الدَّرَكِ الْأَسْفَلِ میں الف لام کو ماقبل کے ساتھ ملا کر لکھنے کے بجائے "الآ" لکھ دیا گیا ہے جو کہ غلط ہے اور معنی کو بدل دیتا ہے۔

۲۔ کتاب کے شروع میں تو فہرست عنوانات دی گئی ہے، مگر کتاب کے درمیان میں بعض جلدوں میں عنوانات ہیں اور بعض میں کوئی عنوان نہیں ہے جو کہ جدید طباعتی معیار کے مطابق نہیں ہے اور جدید تعلیم یافتہ ذہن اس طرز سے نا آشنا ہے جو کہ کتاب کی افادیت کو محدود کرنے کے مترادف ہے۔

۳۔ درمیان کتاب میں جہاں عنوانات لگائے گئے ہیں، ان میں بعض مقامات پر عنوانات کی ترتیب کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ مثلاً جلد 5 صفحہ 273 پر عنوان ہے ”مسکین کی تعریف“۔ اگلے صفحے پر بات مکمل ہونے سے پہلے ہی نیا عنوان ”مسکین کے لیے شرائط“ لگا یا گیا ہے اور اس کے نیچے لکھا ہے: ”مثلاً پلنگ ہیں بسترے ہیں.....“۔ اب یہ جملہ عنوان سے پہلے والے جملے کا حصہ ہے۔ اسے اس سے علیحدہ کر کے خلیجان پیدا کر دیا گیا ہے۔

۴۔ دروس میں بعض جگہ اشعار غلط بھی نقل ہوئے ہیں جو کہ مولانا کے بلند شعری ذوق سے مطابقت نہیں رکھتے، مثلاً جلد 7، صفحہ 276 میں ایک فارسی شعریوں نقل کیا گیا ہے:

در میان قعر تختہ بند کردہ ای

بازی گوئی کہ دامن تر کن ہشیار باش

جب کہ اصل شعر میں پہلا مصرعہ یوں ہے:

در میان قعر دریا تختہ بندم کردہ ای

جلد 9 صفحہ 51 میں ایک ہندو شاعر ہری چند اختر کا شعریوں نقل ہوا ہے:

ملے گی شیخ کو جنت ہمیں دوزخ عطا ہو

بس اتنی بات ہے جس کے لیے دوزخ پناہ ہو

جب کہ اصل شعریوں ہے:

ملے گی شیخ کو جنت، ہمیں دوزخ عطا ہوگا

بس اتنی بات ہے جس کے لیے محشر پھا ہوگا

۵۔ مولانا صفدر الفاظ و تعبیرات کے بادشاہ تھے۔ ان کی پچاس کے قریب کتب گواہ ہے کہ وہ اپنی تحریر میں ایسے الفاظ اور تعبیرات اختیار کرتے تھے کہ سخت سے سخت مخالف بھی ادب لطف کا لطف لیے بغیر نہ رہ سکتا۔ تاہم اس کتاب میں بعض تعبیرات ایسی بھی آگئی ہیں جو مناسب نہیں ہیں، اور اگر مولانا کی نظر سے گزرتیں تو وہ ضرور انہیں تبدیل کر دیتے۔ مثلاً موسیٰ علیہ السلام کا تعارف کراتے ہوئے ایک جگہ یہ تعبیر استعمال ہوئی ہے: ”موسیٰ بچے تھے مگر تماشے کرتے تھے۔“ (جلد 12، صفحہ 341) گو کہ یہ ان کے بچپن کے حالات کے ذیل میں آئی ہے، اس اعتبار سے یہ کوئی گستاخی نہیں ہے، مگر پھر بھی ایک جلیل القدر پیغمبر کے لیے اس طرح کے الفاظ کا استعمال مخالف کے ہاتھ میں ہتھیار دینے کے مترادف ہوتا ہے۔ مناسب ہے کہ اصل پنجابی کو سامنے رکھتے ہوئے ایسی تعبیرات کو مناسب الفاظ سے بدل دیا جائے، اردو میں متبادلات کی کمی نہیں ہے۔

اس مجموعے کی ترتیب و اشاعت کے حوالے سے ایک اور اہم بات کی طرف توجہ دلانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ کتاب کے مرتب مولانا محمد نواز بلوچ ہیں، جبکہ ابتدائی جلدوں کی نظر ثانی مولانا صفدر کے جانشین مولانا زاہد الراشدی نے کی ہے۔ مسودے کی ترتیب و تہذیب کے حوالے سے کتاب کے ابتدائیہ میں لکھا ہے:

”مولانا محمد نواز بلوچ کا طریق کار یہ ہے کہ وہ مضمون کو پنجابی سے اردو میں منتقل کرتے ہیں اور اس کے

بعد حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کے فرزند اکبر اور مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے شیخ الحدیث حضرت مولانا

علامہ زاہد الراشدی صاحب اس پر نظر ثانی کرتے ہیں۔ پھر اس کی کتابت ہوتی ہے، اور دونوں حضرات باری

باری اس کو دوبارہ مطالعہ کر کے چیک کرتے ہیں۔“ (جلد اول، ص 26)

یہ بات کہ مولانا زاہد الراشدی کتاب کے مسودے پر دومرتبہ نظر ثانی کرتے ہیں، ہر جگہ کی ابتدا میں درج ہے۔ تاہم مولانا راشدی نے دریافت کرنے پر بتایا کہ انھوں نے صرف پہلی دو تین جلدوں پر نظر ثانی کی ہے۔ اس کے بعد کسی جلد کا مسودہ طباعت سے قبل ان کے پاس نہیں آیا۔ اسی طرح پہلی دو جلدوں میں مولانا عبدالقدوس خان قارن کا نام نظر ثانی میں آتا رہا ہے، مگر بعد کی جلدوں میں نام نہیں آیا، اور اب نئے ایڈیشن میں تو پہلی جلدوں میں بھی ان کا نام درج نہیں ہے۔ معلوم نہیں، دونوں حضرات نے نظر ثانی کا کام کیوں چھوڑ دیا ہے، حالانکہ صاحب دروس نے کتاب کی اشاعت کے اجازت نامہ میں ان حضرات کا خاص طور پر تذکرہ کیا اور انھیں علمی مشورہ اور رہنمائی کا مجاز قرار دیا ہے۔

ان حضرات کی طرف سے نظر ثانی کا سلسلہ موقوف ہونے کی وجہ سے بعض ایسی باتیں بھی مجموعہ دروس میں پیش کی جا رہی ہیں جو صاحب دروس کے معروف اور جانے پہچانے رجحان فکر سے میل نہیں کھاتیں۔ مثال کے طور پر جلد نہم کے ابتدائیہ میں یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے:

”وفات سے تقریباً چھ ماہ پہلے کی بات ہے۔ تلونڈی موسیٰ خان مولوی نذیر صاحب سرگودھوی کی مسجد میں تبلیغی جماعت آئی جس میں کچھ علماء بھی تھے۔ مولوی نذیر صاحب فرماتے ہیں کہ انہوں نے مجھ سے کہا کہ حضرت کی زیارت کے لیے چلیں، چنانچہ ہم حضرت کے پاس پہنچ گئے۔ ملاقات کے بعد علماء نے سدا جازت کا تقاضا کیا۔ حضرت شیخ نے ایک سے پوچھا کہ تو کہا (کہاں) سے فارغ ہے؟ اس نے کہا، اکوڑہ خٹک سے۔ فرمایا، اس کو سند دے دو۔ دوسرے سے پوچھا۔ اس نے کہا، دارالعلوم کراچی سے۔ فرمایا، اس کو سند دے دو۔ جب تیسرے سے پوچھا تو اس نے کہا کہ رائیونڈ سے۔ فرمایا، اس کو باہر نکال دو۔ اس کے لیے کوئی سند نہیں ہے اور پھر باہر نکلو ادا۔“ (جلد 9 صفحہ 17، 18)

اس واقعے کے حوالے سے کئی اہم سوال پیدا ہوتے ہیں:

پہلی بات تو یہ کہ یہ واقعہ مولانا صفدر کے طبیعت و مزاج کی جو عکاسی کر رہا ہے، وہ ان کی زندگی کے عمومی نچ سے میل نہیں کھاتا۔ یہاں تبلیغی جماعت کی مخالفت سے بڑھ کر امام اہل سنت کے اخلاق اور طرز عمل پر انگلی اٹھتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ مولانا محمد سرفراز خان صفدر دیوبندی فکر کے امین تھے۔ ان کا خاص امتیاز یہی ہے کہ وہ اکابر و اسلاف کی فکر اور منہج کی پوری پوری پیروی کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اسی کی اپنے تلامذہ و متعلقین کو نصیحت فرماتے تھے۔ مولانا دیوبندی دبستان کے تمام حلقوں، اداروں اور جماعتوں کے دینی کاموں کی تحسین و سرپرستی فرماتے تھے اور غلطیوں پر ٹوکتے بھی تھے، مگر بحیثیت مجموعی انہوں نے کبھی بھی دیوبندی فکر کی کسی جماعت یا ادارے کے کام کی مکمل نفی نہیں کی ہے۔ بلند علمی معیار اور دیوبندی فکر کی جماعتوں اور اداروں کی سرپرستی و معاونت کی بنا پر ہی ان کو دیوبندی دبستان میں ’امام اہل سنت والجماعت‘ کے عظیم لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

زیر نظر مجموعہ دروس میں بعض مقامات پر تبلیغی جماعت و اہل سنت حضرات کی بعض بے اعتدالیوں پر متوازن اور اصلاحی تنقید کے ساتھ ساتھ عمومی طور پر تبلیغی جماعت، رائیونڈ مرکز اور وہاں کے دینی ماحول کی تعریف ہی ملتی ہے۔ یہ بات معلوم و معروف ہے کہ مولانا صفدر لگھڑ کی جامع مسجد میں تبلیغی جماعتوں کی آمد پر ان کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے اور عوام کو ان کے ساتھ اس کار خیر میں شرکت کی ترغیب دیا کرتے تھے جس پر لگھڑ کے عوام گواہ ہیں۔

تیسری بات یہ کہ اگر مولانا صفدر تبلیغی جماعت کے نظام اور خاص طور پر رائے و نڈ کے نظام تعلیم سے اس قدر متنفر تھے، اس کی کوئی تصدیق یا تائید مذکورہ ایک واقعے کے علاوہ کہیں سے نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کے کوئی اور شواہد موجود ہیں۔ اگر یہ واقعہ درست ہے تو لازماً اس کی کچھ مزید تفصیلات بھی ہیں جو مذکورہ بیان میں درج نہیں۔ محض رائے و نڈ کا طالب علم ہونے کی وجہ سے سند نہ دینا، کسی بھی قیاس کی رو سے قابل فہم نہیں۔

چوتھی اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ واقعہ مرتب کتاب نے جو نویں جلد کے ابتدائے میں درج کیا ہے، اس کی مناسبت اور موقع محل کیا ہے؟ اس واقعے کا زیر نظر مجموعہ دروس سے کیا معنوی تعلق ہے؟ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ مرتب کتاب مولانا محمد نواز بلوچ گزشتہ کافی عرصے سے تبلیغی جماعت کے متعلق سخت جارحانہ اور منفی موقف رکھتے ہیں

اور اپنی تقریروں میں اس کا اظہار بھی کرتے رہتے ہیں۔ بظاہر یہ لگتا ہے کہ وہ یہ مشتبه و مشکوک واقعہ مولانا کے دروس کے ابتدائی میں درج کر کے قارئین کو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ مولانا صفدر بھی تبلیغی جماعت کے بارے میں وہی رجحان رکھتے تھے جس کا پرچار ان دنوں مرتب کتاب کر رہے ہیں، حالانکہ ان کے خیالات اس حوالے سے مولانا صفدر کے معلوم و معروف نقطہ نظر سے واضح طور پر متضاد ہیں۔

بہر حال، یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اگر کتاب کے مسودے پر مولانا صفدر کے علمی جانشینان مولانا راشدی اور مولانا قارن کی نظر ثانی کا سلسلہ جاری رہتا تو مرتب کی طرف سے اس طرح کے غیر ذمہ دارانہ بیانات کتاب میں شامل نہ کیے جاسکتے۔ اس کے باوجود یہ بات، جو واقعتی طور پر غلط ہے، ہر جلد کے شروع میں تسلسل کے ساتھ درج کرنا بالکل غیر اخلاقی ہے کہ کتاب کا مسودہ مولانا راشدی کا نظر ثانی شدہ ہے۔

ان چند ملاحظات سے قطع نظر، مولانا سرفراز خان صفدر کے ان درسی افادات کو منظر عام پر لانا اور محفوظ کر دینا بہت بڑی محنت ہے جو کہ مرتب مولانا محمد نواز بلوچ کی اپنے شیخ سے محبت اور ارادت کا عمدہ اظہار ہے۔ اسی طرح اس کی اشاعت کا بیڑا اٹھانے والے جناب میر لقمان اللہ صاحب کی محنت اور اخلاص بھی مثالی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کی محنت کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔

محض توجہ دلانے کے لیے چند امور کی نشان دہی کی گئی ہے۔ کتاب کی طبع ثانی کے وقت اگر ان فروگزاشتوں کی اصلاح کر لی جائے تو ان شاء اللہ اس مجموعہ دروس کی افادیت اور فیض کا دائرہ مزید وسیع ہو جائے گا۔

ذخیرۃ الجنان فی فہم القرآن

افادات: شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر

مرتب: مولانا محمد نواز بلوچ

ایک سو بیس اور آخری جلد (پارہ ۳۰) منظر عام پر آچکی ہے

صفحات 519 / قیمت 300

(مکتبہ امام اہل سنت پر دستیاب ہے)